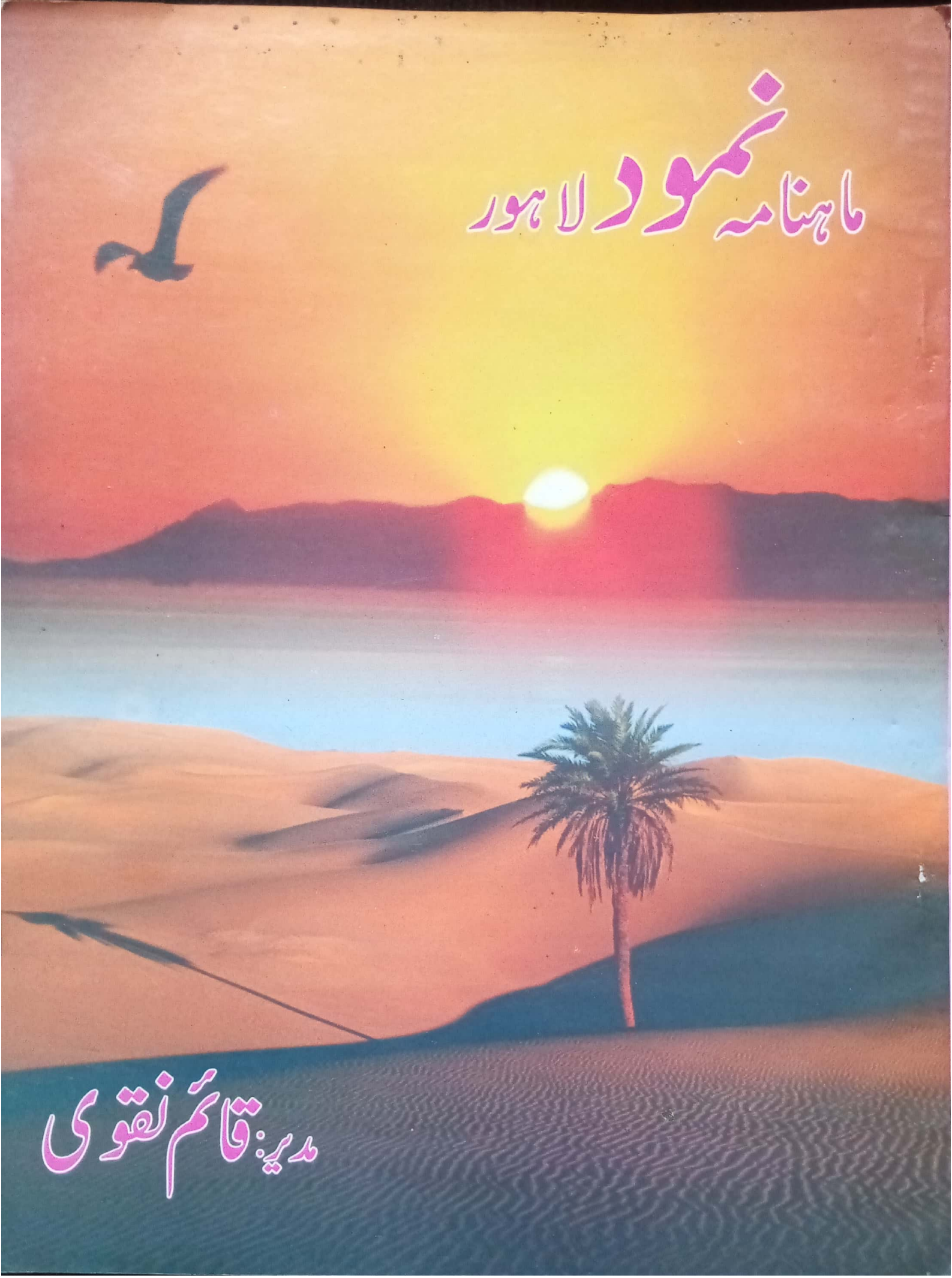
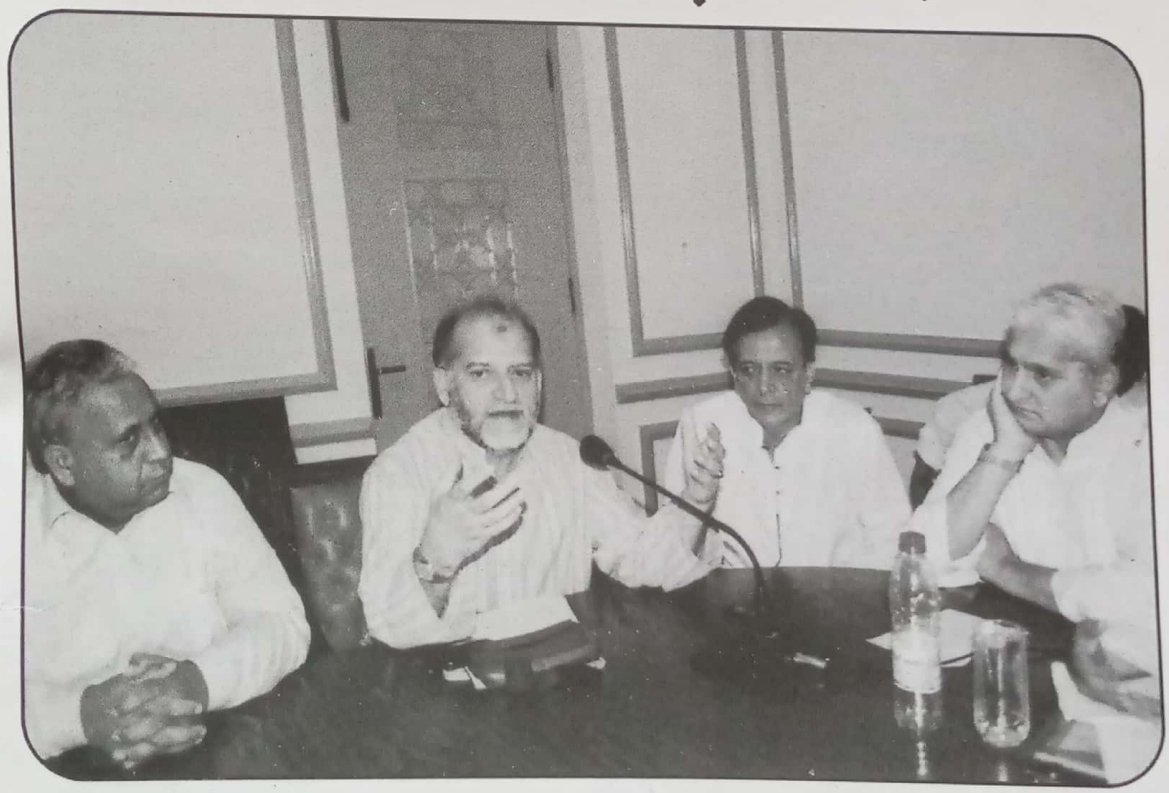


Scanned with CamScanner



بانو قدسیہ، پروین شاکر، اشفاق احمد



اسلم طارق، قائم نقوی، اوریا مقبول جان، ڈاکٹر عالم خان

Scanned with CamScanner

ماہنامہ نمود لاہور

مدیر

قائم نقوی

☆☆☆☆

جلد 2 شمارہ 12-11-10

☆☆☆☆

اکتوبر، نومبر، دسمبر 2014ء

☆☆☆☆

شمارہ -/60روپے

ڈاک خرچ -/100روپے

بیرون ممالک -/10ڈالر

☆☆☆☆

زرِسالانہ بمہ ڈاک خرچ -/600روپے

بیرون ممالک -/60ڈالر

☆☆☆☆

ٹیلی فون: 042-35974195

03015253177:

03314822964:

ای میل

namood.qaimnaqvi@gmail.com

پتہ: 56۔ کوچہ سیف الملوک، سلیم سٹریٹ، چھپڑ سٹاپ، ملتان روڈ، لاہور

قائم نقوی نے نقوی برادرز پرنٹرز دربار مارکیٹ لاہور سے چھپوا کر چھپڑ سٹاپ ملتان روڈ سے شائع کیا۔

Scanned with CamScanner

فہرست

اداریہ

نعت نذرانہ

ناصر بشیر، ڈاکٹر لبنیٰ آصف 4

نذرانہ عقیدت

مشکور حسین یاد 5

خورشید رضوی 6

نجیب احمد، ناصر زیدی 7

لطیف ساحل، طارق حسین زیدی 8

محمد ظفر الحق چشتی 9

اوریا مقبول جان، حسن کاظمی 10

زاہد مسعود، محمد ممتاز راشد 11

خرم خلیق، عمران نقوی 12

مصدق لاکھانی، تنویر قاضی 13

تنویر قاضی 14

فرخ راجا، سلیم الرحمٰن 15

آقائے مظہر عباس 16

آقائے مظہر عباس 17

ساجد گل، واصف سجاد 18

اکرم ناصر 19

ڈاکٹر نبیل احمد نبیل 20

ڈاکٹر اکرم عتیق، محمد افضال انجم 21

ڈاکٹر آصف مغل، کلی زہرا 22

مجید سالک، قائم نقوی 23

مضامین

میں فقیر کربلا شاہی مری ٹھوکر میں ہے، آقائے مظہر عباس 24

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی، اکبر عباس نقوی 29

غزل اور آزاد غزل ناصر بشیر 31

امن کے امکانات نبیلہ کیانی 38

نظمیں

شاہین مفتی 42

شاہین مفتی، ڈاکٹر تقدیس زہرا 43

جاوید آفتاب، سلیم الرحمٰن 44

تنویر قاضی 45

ڈاکٹر لبنیٰ آصف 46

فن اور فنکار

زبیدہ خانم پروفیسر سلیم الرحمٰن 47

افسانے

بابِ دل محمود احمد قاضی 56

خبر کہیں نہیں تھی فرخندہ شمیم 61

نرالا نمود مسلم 64

نزلیں

حسن کاظمی، محمد ممتاز راشد 70

فرخ راجا، محمد علی ظاہر 71

ڈاکٹر نبیل احمد نبیل 72

نقد و نظر

آیاتِ ادب جعفر بلوچ ڈاکٹر اختر علی 74

تاریخ ناروے زاہد مسعود 77

نامے مرے نام

ملور حسین یاد، محمود احمد قاضی 80

شاہدہ حسن

Scanned with CamScanner

اداریہ

اُس پیالے میں زہر تھا ہی نہیں

ورنہ سقراط مر گیا ہوتا.....!!

... وقت کے گزرنے اور انسانوں کے گزرنے میں بڑا فرق ہے۔۔۔ بہت سے معرکوں، جنگوں اور تصفیہ طلب معاملات کے نتائج کبھی موقع پر نہیں ملتے کچھ نتائج تاریخ کی زبانی، تاریخ کے لکھے حرفوں، ان کہے لفظوں، سالوں میں چھپے دکھ سکھ اور انسانی وحیوانی رویوں میں تبدیلی کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ کل تک جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ کہنے والے کتنے زور آر تھے جنہوں نے سچ کو مارنے کا زہر ایجاد کیا تھا مگر زہر بھی ایسا کہ جو انہیں ہی ابدی نیند سلا گیا۔ تاریخ میں چھپے سچ کی فتح تاریخ ہی واضح کرتی ہے کہ کون جیتا کون ہارا۔۔۔ کس پر لعنت کس پر ماتم اور کس کا نام کس کو سلام۔ ہر جنگ جیتی جا سکتی ہے زور زبردستی سے مگر تاریخ جو فیصلہ کرتی اسے کوئی تبدیل تو کیا بھول بھی نہیں سکتا اور اصل فیصلہ بھی یہی ہوتا ہے۔ یقین جانیں زور آور بدن کہنہ قبروں میں گم گئے ہیں۔ قابیل سے لیکر یزید تک کتنے زور آور با اختیار آئے مگر سچ کے سامنے ناٹھر سکے کیونکہ

ع کہتے ہیں

نمود صبح دلیل شب ہے۔۔۔ کہ اس پہلے بھی کوئی شب تھی۔۔۔

کون جیتا کون ہارا،، اختر صبح بتا گیا ہے۔۔

صورت خورشید جو ہے روشن۔۔ وہ ہی سچ ہے

قائم نقوی

Mr. Books
F-6 Super Market, Islamabad Pakistan
Tel:051-2278843-45 2871397
Fax: 051-2278825

Scanned with CamScanner

ناصر بشیر

نعت رسولِ مقبولؐ

پردۂ شب ہٹا دیا، نورِ سحر دکھا دیا
سینۂ کائنات کو ، آپ نے جگمگا دیا
تارے کہیں بچھا دیے، پھول کہیں کھلا دیے
اپنے حبیبؐ کے لیے ، رب نے جہاں سجا دیا
باغِ جہاں میں فصلِ گُل ٹھہری ہوئی ہے تا ابد
خالقِ کائنات نے پھول عجب کھلا دیا
مجھ سے گناہ گار پر کتنا کرم ہے آپؐ کا
گرنے لگا ہوں جب بھی میں آپؐ نے آسرا دیا
آپؐ ہی آخری نبی میرا یہ اعتقاد ہے
نام نبیؐ جہاں لکھا ، ختمہ وہیں لگا دیا
ذکرِ رسولؐ جب ہُوا، ہونٹوں کے پھول کھل اُٹھے
آنکھوں نے بھی خوشی خوشی چشمہ سا اک بہا دیا
سیرتِ پاک میں ملا ، قول و عمل کا امتزاج
جو بھی کہا ہے آپؐ نے کر کے وہی دکھا دیا
آنکھوں میں حیرتیں لیے، ملتے ہیں لوگ اب مجھے
ذرۂ بے نشاں تھا ، آپؐ نے کیا بنا دیا

☆.....☆☆☆.....☆

ڈاکٹر لبنیٰ آصف

نعت رسولِ ثقلینؐ

لفظوں میں کہاں تھا یہ اُجالا شہ والاؐ
ہے نعت تیری میرا حوالہ شہ والاؐ
ہے نور ترا جلوہ فگن صبح ازل سے
عالم میں کہاں تھا یہ اُجالا شہ والاؐ
تو ماہِ مبیں ، نورِ خدا ، نورِ حقیقت
دنیا ہے ترے نور کا ہالہ شہ والاؐ
اک ذرہء ناچیز ہوں میں ، میری طلب کیا
عالم ہے ترا چاہنے والا شہ والاؐ
میں کیا ہوں مری فکر کی پرواز ہی کیا ہے
ہے ذکر ترا ارفع و اعلیٰ شہ والاؐ
جوگن بنوں اور شہرِ مدینہ میں پھروں میں
پہنی ہو ترے عشق کی مالا شہ والاؐ
ہو سانس کی تسبیح پہ جاری یہ وظیفہ
پڑھتی رہوں ہر دم شہ والاؐ شہ والاؐ
جب ڈولنے لگتی ہے رہِ زیست میں لبنیٰ
دیتا ہے ترا اسم سنبھالا شہ والاؐ

☆.....☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

سیّد مشکور حسین یاد

حسینؑ حسینؑ

یہ تیرے صبر کا صدقہ ہے سب حسینؑ حسینؑ
وہ دین ہو کہ دُنیا ہے سب حسینؑ حسینؑ

زمین ہی پہ نہیں گہرا نقشِ کرب وبلا
فضائے عرش علیٰ ہے سب حسینؑ حسینؑ

صحیفہ ہائے تشکّر کے کُھل رہے ہیں ورق
لب خیرد پہ جو آیا ہے سب حسینؑ حسینؑ

سُنو حسینؑ سے بڑھ کر نہیں کوئی آواز
کہ حرف حرف ارادہ ہے سب حسینؑ حسینؑ

ہوں لوگ بہرے تو پھر بات اور ہے ورنہ
پیامِ عالَم پیدا ہے سب حسینؑ حسینؑ

زباں پہ نام حسینؑ آیا کھل گئی آنکھیں
کمال دیدہء بنیا ہے سب حسینؑ حسینؑ

☆.....☆☆☆.....☆

سیّد مشکور حسین یاد

منقبت

علیؑ والے ہیں، احسانِ محمدؐ ہم سمجھتے ہیں
خوشا یہ آگہی شانِ محمدؐ ہم سمجھتے ہیں

گدایانِ درِ علم نبیؐ کو زیب دیتا ہے
کہیں کیسے نہ قرآن محمدؐ ہم سمجھتے ہیں

خدا کا شکر ہے شانِ علیؑ کو ہم نے سمجھا ہے
خدا کا شکر ہے شانِ محمدؐ ہم سمجھتے ہیں

ہمیں آلِ محمدؐ کی وِلا کا فخر حاصل ہے
کسے کہتے ہیں فیضانِ محمدؐ ہم سمجھتے ہیں

ہر آنسو میں نظر آتی ہے تصویرِ رسولؐ اللہ
غمِ شبیرؑ کو جانِ محمدؐ ہم سمجھتے ہیں

مسلسل ذکرِ اہل بیتؑ میں مصروف رہتے ہیں
ہے کیا شے اصلِ ایمانِ محمدؐ ہم سمجھتے ہیں

وِلائے آل میں مشکور ہم نے آنکھ کھولی ہے
نشاطِ ظِلِ دامانِ محمدؐ ہم سمجھتے ہیں

☆.....☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

خورشید رضوی

سلام

نئے برس کا نیا چاند آسماں پہ چڑھا
غمِ حسینؑ میں دل خوں ہوا سناں پہ چڑھا

اِسے ہلال کہیں یا بیادِ کرب و بلا
کہیں کہ خنجرِ دستِ ستم فساں پہ چڑھا

غم حسینؑ وہ غم ہے کہ خضر کہتا ہے
فنا کا رنگ مری عُمرِ جاوداں پہ چڑھا

حسینؑ ابن علیؑ شہسوارِ بے ہمتا
کوئی نہ اُس کی طرح تو سنِ زماں پہ چڑھا

وہ سر بلندِ ازل کوہسارِ ہمّت و عزم
بلا کا سیلِ بلا جس کے کارواں پہ چڑھا

وہ اُس کی یورشِ تنہا ہجوم اعدا میں
اک آفتاب تھا انبوہِ کہکشاں پہ چڑھا

زمانہ خود بھی تحیّر سے اُس کو دیکھتا ہے
کچھ اِس طرح وہ زمانے کی نَردباں پہ چڑھا

چراغِ اِذن بُجھایا جو اُس نے خیمے میں
تو اور نورِ وفا رُوئے عاشقاں پہ چڑھا

اُسی کے دم سے کُھلے مُضمرات انساں کے
اُسی کو دیکھ کے رنگِ یقیں گماں پہ چڑھا

لہو میں ڈوب کے آخر اُسی کی فتح ہوئی
کہ اُس کا نام دلوں میں رہا، زباں پہ چڑھا

بقا کے نور سے روشن ہے اُس کی گردِ سفر
نہ کُہنگی کا غبار اُس کی داستاں پہ چڑھا

ہمیشہ یاد رہیں گے وہ سب نشیب و فراز
کہاں کہاں سے وہ اُترا، کہاں کہاں پہ چڑھا

سلام اُس کو عقیدت سے پیش کر خورشیدؔ
وہ جس کے فیض کا پرتو ترے بیاں پہ چڑھا

☆.....☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

ناصر زیدی

سلام

نہیں کہ عظمتِ حسینؑ ہو بیاں ہم سے
ہے پیش ہدیۂ تبریک چشمِ پُرنم سے
گزر رہی ہے نہایت ہی صبر و شکر کے ساتھ
حسینؑ ابنِ علیؑ زیست، آپ کے دَم سے
یقیں ہے آتشِ دوزخ سے دُور رکھیں گے
ہوئے ہیں اشک رَواں جو عزا کے موسم سے
جنونِ عشق کہیں روکنے سے رُکتا ہے
نہ باز آئیں گے گریہ سے ہم نہ ماتم سے
حسنؑ، حسینؑ ہیں جنت کے مالک و مختار
ڈرا نہ واعظِ ناداں ہمیں جہنم سے
نہ بچ سکے گا نگاہوں میں اُن کے چاند کوئی
لگاؤ رکھتے ہیں جو بھی مہِ محرم سے
خُدا کرے کہ قیامت تلک رہے ناصرؔ!
مرا تعلقِ خاطر حسینؑ کے غم سے

☆.....☆☆☆.....☆

نجیب احمد

سلام

اشک دل سے نظر تک آیا تھا
میرا سرمایا بیش مایا تھا
شاخ سے طائروں کے غول اُڑے
دھیان میں تیر سنسنایا تھا
بہر تسلیم گوہرِ نایاب
سلکِ جاں میں پرو کے لایا تھا
بزم یاراں کے درمیاں تیرے
ذکر نے دیر تک رُلایا تھا
اک تسلی کا ہاتھ تھا جس نے
میرے کاندھے کو تھپتھپایا تھا
موت کے شہر سے گذرتے ہوئے
زندگی کو خرید لایا تھا
نور کی موجِ حق شناسی نے
شب کے دریا میں سر اٹھایا تھا
ایک دریا کی خاکِ نم پہ نجیب
پیاس کا کھیت لہلہایا تھا

☆.....☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

لطیف ساحل

طلوع

طلوع کے سارے منظروں میں اُسی لہو کی تمازتیں ہیں
یزیدیوں کی مُہیب شب اپنے بال کھولے
خوشی کی دیوانگی میں اپنی ہی فتح پر بین کر رہی ہے
گُلِ شہادت
جبینِ سجدہ گزار پر اک ستارۂ صبح بن گیا ہے
عدو کے تیروں سے چھلنی ہیں ساری خیمہ گاہیں
یہ خیمہ گاہیں نہیں ہیں یہ تو فرشتوں کے پَر تنے ہوئے ہیں
سفید رنگوں کے سب پرندے
گُلابی رنگوں کے جام پی کر
بدن کے زنداں سے باری باری طویل رُخصت پہ جا رہے ہیں
اک آفتابی، گلاب چہرہ
مُبارزت کی شبوں سے آزاد ہو رہا ہے
یہ سارا منظر بہت ہے آنکھوں کی روشنی کو
کہ زندگی دے رہا ہے لوگوں کی زندگی کو

☆.....☆☆☆.....☆

طارق حسین زیدی

سلام

دل کی دھڑکن کا مری ایک ہی عنواں ہے حسینؑ
مری چاہت، میرا دارو، میرا درماں ہے حسینؑ
ظلم کی تیرگی دنیا سے مٹانے کے لئے
عدل و انصاف کا اک مہرِ درخشاں ہے حسینؑ
حق کو باطل سے جدا کر کے دِکھا دیتا ہے
دینِ مرسلؐ کا بنایا ہوا فرقاں ہے حسینؑ
اس کے کردار نے منوایا زمانے بھر سے
وارثِ ختمِ رُسُلؐ بولتا قرآں ہے حسینؑ
ساتھ جو ہے وہی حق اور مقابل باطل
ربِّ کعبہ کی بنائی ہوئی میزاں ہے حسینؑ
جو رگِ خون سے تلوار کو فتح کر لے
ایک اللہ کا اعجاز ہے برہاں ہے حسینؑ
آپ کی حرمت و عظمت کا بیاں ہو کیسے
آپ کے در کا تو جبریل بھی درباں ہے حسینؑ
ظلم جو تجھ پہ روا رکھا جفا کاروں نے
بس اسی ظلم پہ یہ دیدۂ گریاں ہے حسینؑ
جس کی الفت کے بنا کچھ بھی نہیں ہے طارقؔ
ہو وہ ایقان کہ عرفان کہ ایماں ہے حسینؑ

☆.....☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

محمد ظفر الحق چشتی

سلام

تاج لولاک کا ماتھے پہ سجانے والے
آج بے گھر ہیں محمدؐ کے گھرانے والے

پابرہنہ جو سوئے شام چلے جاتے ہیں
ہیں یہی لوگ بہشتوں کے خزانے والے

تونے دیکھی نہیں کیا نورِ رسالتؐ کی چمک
تیغ شبیرؑ کی گردن پہ چلانے والے

بے ردا پھرتے ہیں اے چشم فلک دیکھ ذرا
آبرو دینِ محمدؐ کی بچانے والے

ایک چھ ماہ کے معصوم نے رن جیت لیا
دیکھتے رہ گئے حیرت سے زمانے والے

اذن ہم کو درِ حیدرؑ سے ہے ملنے والا
خاک مشہد پہ ہیں ہم اشک بہانے والے

کربلا میں سرِ دریا ہیں کھڑے تشنہ بہ لب
جام کوثر کو زمانے کو پلانے والے

اور توحید ہے کیا اُن کی محبت کے سوا
دور ہٹ اے مجھے توحید سکھانے والے

ہم نہیں ہیں ترا در چھوڑ کے جانے والے
تو نے کیا سوچ لیا شمعیں بجھانے والے

رونے والوں کے دلوں سے یہ صدا آتی ہے
خوش رہیں فرشِ عزا گھر میں بچھانے والے

تا ابد نام ہے زندہ ابنِ حیدرؑ
مٹ گئے خود ہی ترا نام مٹانے والے

اب مرے دل میں ظفرؔ خوفِ قیامت کیسا
پنجتن ہیں مجھے دوزخ سے چھڑانے والے

Scanned with CamScanner

اوریا مقبول جان

سیدنا امام حسینؑ

چشم ستم زدہ کا ستارا ہے اس کا نام
ہر عہد کربلا نے پکارا ہے اس کا نام

غربت ہو، پیاس ہو کہ مسافت ہو عمر کی
طوفان فصل غم میں کنارا ہے اس کا نام

گم ہے ھوائے دشت میں تکبیر حق صفت
حرف دعا پہ سب نے اتا را ہے اس کا نام

کانپے تھے جس سے ظلمت و جبروت کے حصار
اک موج تندوتیز کادھارا ہے اس کا نام

نام حسین شہر الم میں رفیق ہے
تاریک آسمان کاتارا ہے اس کا نام

☆.....☆☆☆.....☆

حسن کاظمی

سلام

دو چار دن کے ظلم نہیں ہیں یزید کے
پیتے ہیں لوگ آج بھی پانی خرید کے

بے چارگی ، کٹا ہوا سر خاک کربلا
یاد آ رہے ہیں کتنے حوالے شہید کے

کرتے ہیں جو حسین کا ماتم گلی گلی
دیکھو یہ کون لوگ ہیں دور جدید کے

مولا قبول کیجئے پیاسوں کے واسطے
لایا ہوں اپنے خون سے پانی کشید کے

ہر شام اپنی شام غریباں سی بن گئی
کٹتے نہیں ہیں اب تو حسن دن بھی عید کے

☆.....☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

زاہد مسعود

اِن دِنوں کی نذر

چمن کی وسعتوں کو دیدہ ور اچھا لگے گا
تلاوت کررہا نیزے پہ سر اچھا لگے گا

لہو جاگے تو کربل کے سفر کا باب پڑھنا
محبت کرنے والوں کا نگر اچھا لگے گا

شہادت ہی نہیں نام و نسب کا سلسلہ ہے
کہ چھاؤں دینے والا ہر شجر اچھا لگے گا

چلی ہے سر فروشی جس گھرانے کی بدولت
ہمیں کیوں نہ بھلا وہ سارا گھر اچھا لگے گا

کہاں اچھے لگیں کے سر جھکا کر چلنے والے
حسینؑ ابن علیؑ سا معتبر اچھا لگے گا

اگر دِل میں رہے گی پنج تن کی یاد زاہد
محرم کا مہینہ عمر بھر اچھا لگے گا

☆.....☆☆☆.....☆

محمد ممتاز راشد

ھدیہ سلام

اعزاز بہت مجھ سے غزل خواں کے لیے ہے
نذرانہ جو یہ نازِ شہیداں کے لیے ہے

شبیرؑ کی گردن کٹی ایمان کی خاطر
شبیرؑ کا غم صاحب ایماں کے لیے ہے

جو زخم ہے معصوم شہیدوں کے سبب سے
اس زخم کی تکلیف رگِ جاں کے لیے ہے

سب کو ہے خبر ، اُسوۂ شبیرؑ پہ چلنا
خطرات سے پُر ، ظلم بہ داماں کے لیے ہے

تبلیغ جو کربل میں ہوئی خون سے راشد
تاحشر وہ ہر دَور کے انساں کے لیے ہے

☆.....☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

خرم خلیق

سلام

خدا کا ہم پہ کرم ہے حسینؑ کے صدقے
عبادتوں کا بھرم ہے حسینؑ کے صدقے

ہر اک غم ، غم کرب وبلا میں ڈوب گیا
غمِ حیات بھی کم ہے حسینؑ کے صدقے

جہان والے، جہنم بنا رہے تھے اِسے
زمین مثلِ ارم ہے حسینؑ کے صدقے

یزیدیت کے سبب ٹوٹ کر بکھر جاتی
یہ کائنات بہم ہے حسینؑ کے صدقے

بفیضِ ماتمِ شبیرؑ ،دل سلامت ہے
ہمارے سینے میں دم ہے حسینؑ کے صدقے

ملی ہے خواب میں فہرستِ ساکنان بہشت
ہمارا نام رقم ہے حسینؑ کے صدقے

فرات لفظوں کی خرم بہے تو کیوں نہ بہے
رواں جو میرا قلم ہے حسینؑ کے صدقے

☆.....☆☆☆.....☆

عمران نقوی

سلام

تیروسناں کی اور نہ لشکر کی بات ہے
ہونٹوں پہ آج صرف بہتر کی بات ہے

خوشبو کا قافلہ نہیں رُکتا ، سو دیکھ لو
اصغرؑ کی بات ہے کہیں اکبرؑ کی بات ہے

آنسو غمِ حسینؑ میں بہتے ہیں رات دن
اے چشمِ خوش نصیب ! مقدر کی بات ہے

ہوگی کبھی نگاہ سے باہر کی بات بھی
فی الحال تو نگاہ کے اندر کی بات ہے

عمران کیوں سخن سے نہ چھلکے مرا لہو
یہ کربلا کی بات مرے گھر کی بات ہے

☆.....☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

مصدق لاکھانی

سلام

یقینِ حق کا حوالہ حسینؑ کا سجدہ
حسینؑ جیسے ہیں ویسا حسینؑ کا سجدہ

حصارِ عرش سے آگے مصلیٰء خاکی
فرازِ عشق سے اعلیٰ حسینؑ کا سجدہ

ہر انجمن میں بہت عبدیت کا ذکر ہوا
تو عبدیت میں بھی کیا تھا حسینؑ کا سجدہ

بصد غرور زمیں سر اُٹھا کے چلنے لگی
جب آسمان پہ پھیلا حسینؑ کا سجدہ

جبیں کا کھیل سرِ خاک کرنے والوں کو
کبھی سمجھ میں نہ آیا حسینؑ کا سجدہ

سپردگی کی وسیع و عریض دنیا میں
بس ایک ہی تو ہے سجدہ حسینؑ کا سجدہ

کھلا ہے راز مصدقؔ یہ عصرِ عاشورہ
مزاجِ لائقِ سجدہ حسینؑ کا سجدہ

☆.....☆☆☆.....☆

تنویر قاضی

سلام بحضور امام حسینؑ

ابھی تک کربلا ہے آبدیدہ
کہ دریا بھی مِلا ہے آبدیدہ
بھرے اشکوں سے آنکھوں کے کٹورے
زمانے کی انا ہے آبدیدہ
اُفق تک پھیلتی شامِ غریباں
کہ پہلے سے سِوا ہے آبدیدہ
ہمیں تعلیم ہے خُطبۂ زینبؑ
سُنا جس نے ہوا ہے آبدیدہ
تری یادوں کے دوارے پھول رکھتے
ہر اِک دستِ دُعا ہے آبدیدہ
بجھایا جب دیا دے کر اجازت
چراغِ دل رہا ہے آبدیدہ
ابد تک مرثیہ خوانی کرے گا
مسلسل رتجگا ہے آبدیدہ
پسِ دشتِ الم مہندی کی خوشبو
سرِ کربل حنا ہے آبدیدہ
جلے خیموں کی خاکستر کو تھامے
سرِ مقتل ہوا ہے آبدیدہ
فراتِ جاں فدا ہے تشنگی پر
سرِ مژگاں گھٹا ہے آبدیدہ
سلام اُس کی حیاتِ جاوداں پر
شہادت پر خدا ہے آبدیدہ

☆.....☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

آقائے مظہر عباس

سلام

جو تخت کو بھی مار دے ٹھوکر ذرا سوچو
کیا ہو گا کوئی اس کے برابر ذرا سوچو
موتی سے ٹپکتے تھے کسی چشمِ حزیں سے
آغازِ مسافت کا وہ منظر ذرا سوچو
ایسا بھی عجب سانحہ دُنیا نے ہے دیکھا
صحرا میں تھا اک پیاسا سمندر ذرا سوچو
خوں گشتہ و بے گوروکفن کتنے دنوں سے
تصویرِ پیمبرؐ تھی زمیں پر ذرا سوچو
بے شیر گلا تیر کے لائق تھا بھلا کیا
تم قہرِ خداوند سے ڈر کر ذرا سوچو
گھوڑوں کے سُموں کے تلے روندا گیا اس کو
جو دین کا دُنیا میں تھا محور ذرا سوچو
ہر شخص کی تجہیز ہے اسلام میں واجب
بے گوروکفن تھے جو بہتر ذرا سوچو
یہ سبطِ پیمبرؐ کی غلامی کا اثر
ہر شعر مودّت کا ہے مظہر ذرا سوچو

☆.....☆☆☆.....☆

آقائے مظہر عباس

نورکا یہ قافلہ

نورکا یہ قافلہ
جانے چل دیا کہاں
یہ بھی جانتے ہوئے
ظلم ہونے والا ہے
خون بہنے والا ہے
بدلیوں کے چنگل میں
چاند گھرنے والا ہے
فاطمہؑ کے دل برکا
گھر اُجڑنے والا ہے
سوچ لو مسافرو!
تشنگی ستائے گی
طفلِ شیر خوار کو
سُرخ موت آئے گی
چشمِ پیش بین نے
یہ سماں بھی دیکھا ہے
ایک نوجوان جو
مصطفےٰ سے ملتا ہے
چہرۂ حسیں لیے
سوئے موت بڑھتا ہے
گھاٹ گھاٹ قاتل ہے
ایک رقصِ بسمل ہے
خاک و خوں میں اکبرؑ ہے
بال نوچتی زینبؑ
یورشِ غم و حسرت
کیوں پھٹی نہیں زمیں
کیوں گرا نہیں فلک

Scanned with CamScanner

فرخ راجا

سلام

حسینؑ اہل نسب میں سدا یگانہ ہے
وہ نُور والوں میں آکر چراغِ خانہ ہے
خدا کا ذکر ہے جب تک رہے گا ذکرِ حسینؑ
ہر عہد اُس کے لئے اُس کا ہر زمانہ ہے
وضوئے اشکِ عزا بھی نماز ماتم بھی
یہی عمل ہے مرا اور پنجگانہ ہے
رموز مملکتِ عشق جاننے کے لئے
مسافروں کا فقط کربلا ٹھکانہ ہے
جو کھائیں مل کے تبرک حُسینؑ کے در سے
کمال اُن کے مقدر کا آب و دانہ ہے
پکارتے رہے سب کو حسینؑ ابنِ علیؑ
جواب کیا ہے؟ نہ جانے کا اک بہانہ ہے
نہ حرملہ سمجھ پایا فطرتِ اصغرؑ
تو جتنے تیر چلا اُس نے مسکرانا ہے
سزا ملی نہ کسی کو ہوئے ہیں قتل حسینؑ
اِسی لئے مرا انداز باغیانہ ہے
یہ کہہ رہے ہیں جہاں کو اویسؓ اور بلالؓ
عمل قبول ہے فرخ جو عاشقانہ ہے

☆.....☆☆☆.....☆

سلیم الرحمٰن

نوحہ

وائے حسینا۔۔۔۔۔۔۔؛

چھلنی ہیترے غم سے جگر وائے حسینا
روتا ہے مرا دیدۂ تر وائے حسینا
اکبر وہ ترا رشک قمر وائے حسینا
اصغر وہ ترا لخت جگر وائے حسینا
ہے بیچ یم ہجر سکینہ کا سفینہ
اور دھول کا ہر سمت بھنور وائے حسینا
وا منتظر خیمۂ دل؛ تیرا نصیبا
عباس کی آئی نہ خبر وائے حسینا
سکرات کی حالت میں بھی بھولوں گا نہیں میں
نیزے کی انی اور وہ سر وائے حسینا
: ایں ماتم سخت است؛ در باب ترابی
شاہ بود کجا، دست نگر وائے حسینا
کہتا ہے یہ دل اور یہ کہتا ہی رہے گا
ہر بار با انداز دگر وائے حسینا

☆.....☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

ساجد عمر گل

منقبت

حسینؑ نقشِ یزداں بھی ، حسینؑ اصلِ ایماں بھی
حسینؑ سے ہیں درد و غم، حُسین ان کا درماں بھی

حسینؑ ہے رسولؐ سے ، رسول ہیں حسینؑ سے
حسینؑ حق کا مضموں بھی، حسینؑ حق کا عنواں بھی

حسینؑ اسمِ اعظم وہ جو ہے محیط دہر پر
حسینؑ کے وسیلے سے نجات کا ہے ساماں بھی

حسینؑ سے ہے زندگی ، حسینؑ روحِ بندگی
حسینؑ اوجِ عبدیت ، حسینؑ فخر یزداں بھی

حسینؑ کی شہادت سے ملی ہے دیں کو زندگی
حسینؑ تا قیامت ہے فخرِ نوع انساں بھی

☆.....☆☆☆.....☆

واصف سجاد

سلام

ملے ہمیں بھی جو بابِ عطا حسینؑ کا ہے
خدائے ارض و سما واسطہ حسینؑ کا ہے

ڈرا سکے گی ہمیں کیا درازئ ظلمت
کہ جل رہا ہے جو دل میں دیا حسینؑ کا ہے

کبی جو رات کو دن کہ نہیں سکے ہم لوگ
یہ حوصلہ بھی تو بخشا ہوا حسینؑ کا ہے

تمام شر پہ ہے کارِ یزیدیت کی بنا
جہاں میں خیر کا ہر زاویہ حسینؑ کا ہے

خدا سے ربط جداگانہ ہے مرا واصفؔ
حسین سے ہے تعلق خدا حسینؑ سکا ہے

☆.....☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

اکرم ناصر

سلام

اک حشر کا سماں تھا کنارے فرات کے
ہر شخص نوحہ خواں تھا کنارے فرات کے

اک ضد گھی ہوئی تھی کہ بہنا ہے ساتھ ساتھ
دریائے خوں رواں تھا کنارے فرات کے

خنجر کا، خوں کا، خاک کا، پانی کا، پیاس کا
ہر شے کا امتحاں تھا کنارے فرات کے

گنتی کے جانثار تھے پر جانثار تھے
انبوہ دشمناں تھا کنارے فرات کے

آنکھوں سے دیکھ کر بھی زمیں پر گرا نہیں
یہ کیسا آسماں تھا کنارے فرات کے

☆.....☆☆☆.....☆

اکرم ناصر

سلام

اک چھینٹا تھا چار سو منظر تھا شام کا
لپٹی ہوئی خون کی چادر میں کائنات
سورج کی لاش کفن میں اتری تو دفعتاً
پھر روشنی کا سیلِ رواں پھیلنے لگا
حیراں ہیں اس پہ آج تک میدان کربلا

میدان کربلا کو سجانے کے واسطے
کچھ پھول اور کلیاں مدینہ سے آئے تھے
بے آب سی زمیں میں جوش نمو تو تھا
صحرا کا صحرا دیکھتے گلزار بن گیا
حیراں ہے اس پہ آج تک پانی فرات کا

پانی کی لہریں چیختی اور سر پٹختی تھیں
اُٹھ اُٹھ کے بھاگتی رہیں گو پا بجولاں تھیں
ساحل کی قید تھی کہیں نیزوں کی باڑ تھی
میدان کربلا کی جب قسمت سنور گئی
کچھ لوگ زندہ رہ کے بھی ملعون ہوگئے
کچھ موت اُوڑ کر بھی یہاں سُرخرو رہے
فانی لبادہ جسم کا اکرم اُتار کر
پہنی حیاتِ جاوداں اور ہو گئے امر

☆.....☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

ڈاکٹر نبیل احمد نبیل

سلام

ہوا ہوں میں دل و جاں سے غلام عالی مقام
مرا سلام تجھے اے امام عالی مقام
ہماری آنکھوں میں سارا ہی نم حسینؓ کا ہے
دلِ بشر میں رہے گا یہ غم حسینؓ کا ہے
ہم اہلِ غم پہ حقیقت جو ظلم کی ہے کھلی
ہم اہلِ غم پہ یہ سارا کرم حسینؓ کا ہے
بس ایک نام ہے ایسا جو ہے دلوں پہ رقم
جو نامِ نامی ہے دل پر رقم حسینؓ کا ہے
یہیں سے جاتا ہے جنّت کو راستہ لیکن
یہ کربلا، یہی باغِ ارم حسینؓ کا ہے
جو جانتا ہے صداقت کے استعاروں کو
کہ نام لیوا وہی دم بہ دم حسینؓ کا ہے
زمانے والو! اِسے ہار کہہ نہیں سکتے
ہر ایک ہاتھ میں دیکھو علم حسینؓ کا ہے
یہ کائنات کبھی اس کو بھول سکتی نہیں
اِک ایسا بابِ صداقت رقم حسینؓ کا ہے
غمِ حسینؓ میں سوئی نہیں ہیں عمرِ تمام
ہماری آنکھوں میں اشکوں کا رم حسینؓ کا ہے
اُسی وسیلے سے پانی ہے میری آنکھوں میں
مری نظر میں یہ سارا ہی نم حسینؓ کا ہے
کہانی ظلم کی تُو بھی بُھلا نہیں پایا
فُراتِ عصر تجھے بھی تو غم حسینؓ کا ہے
وہاں وہاں پہ صداقت کے جل پڑے ہیں چراغ
پڑا جہاں پہ بھی نقشِ قدم حسینؓ کا ہے
کہ جس نے حق کی سدا ہی رقم کی ہے تاریخ
زمانے والو! وہی اک قلم حسینؓ کا ہے
اسی لیے تو یہ بنجر کبھی نہیں ہوتے
دل و نگاہ میں اپنے جو نم حسینؓ کا ہے
یہ کائنات اسے کس طرح بُھلائے گی
جو ایک بابِ صداقت رقم حسینؓ کا ہے
سلیقہ جس نے مجھے حق کا کر دیا ہے عطا
میں خوش نصیب ہوں دستِ کرم حسینؓ کا ہے
مدینے سے اُسے جانا تھا سچ علم لے کر
یہ حوصلہ، یہ قدم، دم بہ دم حسینؓ کا ہے
یزید کے لیے بیعت نہ کی، نہ کرنا تھی
بلند آج بھی دیکھو علم حسینؓ کا ہے
اِسے خُدا نے دیا ہے کچھ ایسا اوج کہ یہ
رہے گا حشر تک اُونچا علم حسینؓ کا ہے

☆.....☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

محمد افضال انجم

سلام بحضور امام عالی مقامؑ

آپؑ کا غم جسے عطا نہ ہوا
زندگی سے وہ آشنا نہ ہوا
کون سا ظلم تھا زمانے میں
اہل کربل پہ جو روا نہ ہوا
پھر مدینے سے قافلہ ایسا
کربلا کو نہ یوں روانہ ہوا
پھر بہتر نہ یوں ہوئے قرباں
پھر کبھی ایسا سانحہ نہ ہوا
خوف لاحق نہ کیوں ہو رہزن سے
آپؑ سا کوئی رہنما نہ ہوا
ڈٹ گئے آپؑ ظلم کے آگے
یوں کسی سے یہ حوصلہ نہ ہوا
جیسے بچھڑی سکینہ بابا سے
باپ سے یوں کوئی جدا نہ ہوا
سر کبھی یوں کوئی سر نیزہ
سربلند آپؑ کے سوا نہ ہوا
جس نے پالا حسینؑ کے غم کو
وہ کبھی غم میں مبتلا نہ ہوا
کم نصیب اس سا کون ہے انجم
آپؑ کے در کا جو گدا نہ ہوا

☆.....☆☆☆.....☆

ڈاکٹر اکرم عتیق

سلام

صدق و صفا و جرأتِ کردار کے اصول
ہیں معتبر تو واقعۂ کربلا نہ بھول

دیکھے تھے ہو کے وقت نے اشکوں سے باوضو
کرب و بلا میں گلشنِ زہراؑ کے پاک پھول

میدانِ کربلا سے نہ گزرے اگر خیال
قربانیوں کے باب کا ہوتا نہیں نزول

آنسو رواں ہیں آنکھ سے ذکرِ حسینؑ پر
دل میں بسا ہوا ہے جگر گوشۂ بتولؑ

میں لشکرِ حسینؑ کا اک فرد ہوں عتیقؔ
مجھ کو یزیدِ وقت کی بیعت نہیں قبول

☆.....☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

ڈاکٹر آصف مغل

شانِ حسینؑ

کمال صِدق و صفا حُسنِ کائنات حسینؑ
شبیہہ مصطفوی آئینہ صفات حسینؑ

بگڑے بنتے رہیں گے نقوش دنیا کے
سدا رہے گی زمانوں میں تیری بات حسینؑ

ہمیں ڈرا نہ سکے گی یزید عصر کی فوج
ہمارے سر پہ علیؑ ہیں ہمارے ساتھ حسینؑ

جو پیش کفر و ریا ہے چراغ کرب و بلا
تو پیشِ ظلمتِ شب کلمہء نجات حسینؑ

درِ بتول پہ بیٹھا ہے عمر سے آصفؔ
ہو اس طرف بھی کبھی چشم التفات حسینؑ

☆.....☆☆☆.....☆

کلی زہرا

سلام

لہجے کی جس گرج سے لرزتا ھے اب بھی شام
فاتح ھے کربلا کی وہ زینب ھے اسکا نام

جس نے ردا کی چھاوں میں پالی حسینیت
بعد از حسین جس نے سنبھالی ھسینیت

زھرا کا روپ ھے تو مجسم علی کبھی
ھے پنجتن کا زین شفاعت کی ھے کڑی

اسکے سفر کی دھول سحر کی نوید ھے
اسکا تو اک قدم ھی زوال یزید ھے

معراج ھق کی ایک مکمل دلیل ھے
دشمن جو اسکا ھے وہ ابد تک ذلیل ھے

اسکی حیا کا رنگ گھلا اسمان ھے
اسکی عطا ھے دین پہ اب سایبان ھے

☆.....☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

مجید سالک

سلام

منبع ء صدق و صفا تم پر سلام
پیکر صبر و رضا تم پر سلام
تم نے رکھا نانا کے دیں کا بھرم
اے شہیدِ کربلا تم پر سلام
ہوگئے قربان سارے جانثار
لاشے پہ لاشہ اٹھا تم پر سلام
دے سکتا نہیں کوئی اس کی مثال
سجدہء آخر ترا تم پر سلام
جب چڑھا نوک سناں پر سر ترا
اس نے کلمہ حق پڑھا تم پر سلام
معنوی توقیر دی اس لفظ کو
اے شہیدِ با وفا تم پر سلام
رب نے دی سرداری جنت کی تمہیں
تھا نبیؐ نے کہہ دیا، تم پر سلام
سارے مسلم ایک بس سالکؔ ہی کیا
تیرے غم میں مبتلا تم پر سلام

☆.....☆☆☆.....☆

قائم نقوی

سلام

تلاشِ حق میں جو پیہم دواں ہیں
تری جانب رواں وہ کارواں ہیں

یقیں معمورۂ کرب و بلا ہے
گلِ باطل گلِ گردِ گماں ہیں

اِنہی کے دم سے نورِ آدمیت
اِنہی کے دم سے روشن دو جہاں ہیں

نبیؐ کا گھر ستارا پھول خوشبو
یہ مینارِ ہدایت کے نشاں ہیں

سرِ نیزہ جو نکلے کربلا سے
یہی سردارِ شبّانِ جناں ہیں

چلا ماہتابِ آفاق مدینہ
نئی گردش میں ساتوں آسماں ہیں

☆.....☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

میں فقیرِ کربلا، شاہی مری ٹھوکر میں ہے

آقائے مظہر عباس

دینی ادب میں عقیدتِ جاوداں اور غمِ جاوداں (تجلّیاتِ قمر) کے خالق، دبستانِ دہلی و لکھنؤ کے حسین سنگم، اپنے ہم عصروں میں اُستاد کے نام سے پہچانے جانے والے، ممتازِ زمانہ اور یکتائے روزگار شاعرِ اہلِ بیتؑ حضرت سید محمد حسین قمرؔ جلالوی نے بہت کم سنی میں اشعار کہنا شروع کیے اور اپنے سے معمر شعراؑ کی اُستادی کا شرف حاصل کیا۔

بقولِ بعض اُن کی شاعری علاّمہ نصیر لاجتہادی کے مطابق: ''مرگِ پسر پر کس طرح صبر ہوتا ہے اور محرابِ خنجر کے نیچے کس طرح شکر ہوتا ہے کی تفسیر ہے۔''

اکثر ناقدین کے بموجب قمرؔ پیدائشی شاعر اور قلندر منش انسان تھے۔ اکتسابی جُزو کم تھا، بڑا بانکا شعر کہتے تھے شعریت اُن کے کلام میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور اپنا الگ رنگ رکھتے تھے نیز ہر ایک سوادِ شعر کے پیچھے قمرؔ کی روشنی ہے۔ عقیدت کے جو پھول اُنھوں نے نذرِ آلِ رسولؐ کیے وہ عنداللہ قبول اور عندالناس مقبول ہیں۔

قمرؔ جلالوی کی فنی عظمت کے ثبوت کے لئے اگرچہ اُن کی غزلیات اور مراثی بھی کم نہیں (کیونکہ بقول ڈاکٹر یاور عباس ایک اچھا شاعر مرثیہ کہہ سکتا ہے اور قمرؔ کو ہم اس سلسلے میں غزل گو قمرؔ سے پیچھے نہیں پاتے۔ لیکن نبضِ زمانہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے، آج کے جدید قاری و سامع حضرات کے ذوق کے مطابق ہم اُن کی سلام نگاری ہی کو زیرِ بحث لاتے ہیں۔

غمِ جاوداں میں تجلّیاتِ قمرؔ سلامِ عقیدت کی صورت یوں اختیار کرتی ہیں:

بصد خلوص و عقیدت سلام کہتی ہے
حسینؑ تم کو محبت سلام کہتی ہے
حرم لئے ہوئے بیٹھے تھے جس اندھیرے میں
قمرؔ وہی شبِ ظلمت سلام کہتی ہے

یا پھر:

؎ غریب و بے کس و مظلوم و تشنہ کام سلام علیؑ کے چاند، نبیؐ کے مہ تمام سلام

اثر ہے یہ ترے اک کربلا کے سجدے کا نماز ہو گئی قائم مرے امامؑ سلام

اہلِ بیتؑ شناس شعرا کے یہاں سلام ایک ایسی صنفِ سخن ہے جو غزل کی ظاہری ہیئت میں غزل کی معنوی وسعت بھی رکھتی ہے۔ میری مراد یہ ہے کہ جس طرح غزل میں کم و بیش ہر طرح کے مفاہیم و مطالب کو بیان کیا جا سکتا ہے اُسی طرح سلام میں بھی محمدؐ و آلِ محمد کے حوالے سے ہر دینی و دُنیوی نعمت، برکت اور فضیلت کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے وہ صنف جسے کچھ لوگ صرف شہدائے کربلا کے ذکر تک محدود کرتے ہیں، اس میں نعتیہ اشعار کس طرح ضَوریز ہوتے ہیں۔

؎ یہ معجزہ ہے عرش پر آئے گئے رسولؐ
نقشِ قدم مگر نہ ملے رہگزار کے

؎ بسترِ ختمِ رسالت نہیں رہتا خالی
جب نبوت کہیں جاتی ہے امامؑ آتا ہے

اَب سلام کے کچھ ایسے اشعار بھی ملاحظہ فرمائیں جو منقبت کے تیور لئے ہوئے ہیں۔

؎ مرحب کا قتل بھی کوئی خیبر میں قتل تھا
پھینکا تھا ذوالفقار کا صدقہ اُتار کے

خیبر کے در نے کھل کے اشارہ یہ کر دیا
مظہر یہی ہیں قوتِ پروردگار کے

جانے سوال کیا ہوئے مرقد میں اے قمرؔ
چپ ہو گئے تھے ہم تو علیؑ کو پکار کے

یہ کہہ کے چل دیئے رضواں سے ہم سوئے کوثر
علیؑ کے بادہ کشوں میں ہمارا نام بھی ہے

بہک نہ جاتے نصیری تو اور کیا کرتے
علیؑ کتابِ خدا میں خدا کا نام بھی ہے

Scanned with CamScanner

قمرؔ فرشتوں نے پیہم لحد میں سُن کے کہا
علیؑ علیؑ کے سوا اور کوئی کام بھی ہے

حرفِ جاوداں کا پندرہواں سلام تو پورے کا پورا منقبتِ علیؑ میں ہے۔ قمرؔ نے اپنے ان محولہ بالا دونوں سلاموں میں اپنا تخلص آخری دو دو اشعار میں استعمال کیا ہے جو اُن کی انفرادیت بھی ہے اور اُن کے تخلص کا کمالِ حُسن بھی۔

مثلاً اوپر بیان کیے گئے مقطعِ اوّل کے بعد مقطعِ ثانی یہ ہے۔

؎ یہ بزمِ ساقیِ کوثر میں ہے قمرؔ شاید
جو کہہ رہا ہے اِدھر آپ کا غلام بھی ہے

قمر جلالوی کا سلام دیگر اہلِ بیت شناس سلام گوؤں کی طرح چودہ معصومینؑ، شہدائے کربلا اور اَسیرانِ کوفہ وشام کی مدحت ومنزلت اور آلام ومصائب کا عکاس ہے۔ ان تینوں ممدوحین کی شان میں مدحیہ وعزائیہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

؎ نجف تا سامرہ گو چودہ میخانے نکل آئے
مگر ساقی ہمارے جانے پہچانے نکل آئے

؎ چودہ میخانوں میں جب بھی کہیں جام آتا ہے
سب سے پہلے ہمی میخواروں کا نام آتا ہے

؎ دیکھ کر مجھ کو قمرؔ شور اُٹھے گا سرِ حشر
راستا دو شہِ والاؑ کا غلام آتا ہے

؎ غُل اہلِ مدینہ میں ہے بپا شبیرؑ مدینہ چھوڑتے ہیں
کب دیکھئے واپس لائے خدا شبیرؑ مدینہ چھوڑتے ہیں

؎ جبریلؑ کے دل میں غم ہو نہ کیوں جھولے میں جھلایا ہے برسوں
روتے ہیں امینِ وحیِ خدا شبیرؑ مدینہ چھوڑتے ہیں

؎ لیلےٰ کے دل کو دیکھ رہے ہیں شہِ زمنؑ
اکبر کو رن میں بھیجا ہے گیسو سنوار کے

Scanned with CamScanner

؎ اصغرؑ جگر کو تھام کے روتی ہے فوجِ شام
تم تیر کھا کے آئے ہو یا تیر مار کے

؎ شکرِ سجادؑ پہ کہتے تھے تعجب سے لعین
کتنا آزاد یہ پابندیِ زنجیر میں ہے

؎ سرِ زینبؑ کو کہے کون کھلا یا نہ کھلا
یہ تو اک راز ہے جو چادرِ تطہیر میں ہے

؎ مرنے والے کس لئے ڈرتا ہے کہتے ہیں علیؑ
کون سے مومن کی تربت ہے جو ہم آئے نہیں

؎ جب فرشتوں نے اُٹھایا قبر میں بولے علیؑ
ہم تری بالیں پہ ہیں موجود گھبرانا نہیں

قمرؔ کے سلاموں میں اس قدر سوز و گداز ہے اور ایسا مترنم اندازِ اظہار ہے کہ سلام و نوحہ کا خفیف سا فرق ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ اُن کے اکثر سلام نوحوں کی سی نرم و ملائم اور رواں دواں بحروں میں ہیں۔ اوپر دیئے گئے اکثر اشعار ہمارے اس دعویٰ کی دلیل ہیں۔

قمرؔ جلالوی نے نہ صرف فنی حوالوں سے اُستاد ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ بلکہ وہ فکری حوالے سے بھی اُستاد ہیں۔ اُستاد نے اپنے کلام میں فلسفۂ شہادتِ حسینؑ، حقیقتِ اسلام اور تاریخِ اسلام کی نہایت فصیح و بلیغ ترجمانی کی ہے۔ اُن کے سلاموں ہی کے کچھ اشعار بطور اَمثلہ پیشِ خدمت ہیں۔

؎ تُو حسینؑ تشنہ لب کو نہ سمجھ سکا' تو سُن لے
وہ شہیدِ راہِ حق ہے جو حیات سَر بہ سَر ہے

؎ کربلا کے واقعہ سے حق و باطل کی تمیز
نسلِ انساں کو شہِ دینؑ کی بدولت ہو گئی

؎ کوئی قرآن کو جُز آلِ نبیؐ کیا سمجھے
ایک عالَم ہے کہ اُلجھا ہُوا تفسیر میں ہے

؎ اہلِ کوفہ نے دغا مسلمؑ سے بے تقصیر کی
خود لکھا بیعت کریں گے حضرتِ شبیرؑ کی

Scanned with CamScanner

؎ قمرؔ اسلام کی تاریخ میں اس کے سوا کیا ہے
حقیقت جب ہوئی رُو پوش افسانے نکل آئے

صنفِ سلام کو چونکہ کچھ احباب نے کربلا اور پسِ کربلا یعنی تحریکِ کربلا اور تاریخِ کربلا سے مخصوص جانا ہے، لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرتِ قمرؔ کے کچھ ایسے شعر بھی درج کئے جائیں جو لہولہو، اشک اشک اور در بہ در کیفیتوں کے حامل ہوں جو کربلا میں اور کوفہ و شام میں ہونے والے ظلم و ستم اور جبر و استبداد کی منظوم کہانی بیان کرتے ہوں اور جن کو پڑھ کر گریہ و بین اور رِقّت روکے سے بھی نہ رُکے:

؎ شام تک کیا کیا غبارِ راہ نے پردے کئے
سر کھلے دیکھے جو وارث چادرِ تطہیر کے

؎ جائیں فریادِ سکینہؑ پہ مدد کو کیوں کر
پاؤں تو حضرتِ سجادؑ کا زنجیر میں ہے

؎ کہہ کے روتی تھی سکینہؑ دیکھ کر سوئے فلک
تازیانے اور مرے بیمار بھائی کے لئے

؎ قضا بولی علی اصغرؑ کو جب میدان میں دیکھا
کہ تم بھی حلق پر تیرِ ستم کھانے نکل آئے

؎ خون میں ڈوبے ہوئے اصغرؑ ہیں شہؑ کی گود میں
اے قمرؔ کیا چاند سی صورت کی صورت ہوگئی

قمرؔ جلالوی کی سلام نگاری کے ان اوصاف و خصوصیات کے بیان کو ہم قلتِ قرطاس کے سبب سے انہی کے اس شعر پر ختم کرتے ہیں جو اُن کی سلام نگاری کی عظمت و مقبولیت پر دال ہے۔

قصیدہ پڑھنے جو بیٹھا میں بزمِ ساقی میں
تو میکشوں میں اُٹھا غُل قمرؔ سلام سلام

☆☆☆☆☆

Scanned with CamScanner

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ

اکبر عباس نقوی

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ محض سندھ یا سندھی زبان کے عظیم شاعر نہیں ہیں بلکہ ان کی شخصیت عالمگیر ہے۔ ولی اللہ کا پیغام ایک مخصوص طبقے یا زبان کے لئے نہیں ہوتا بلکہ یہ پوری دنیا اور انسانیت کے لئے ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسے خزانہ کی مانند ہے جس سے ہر کوئی اپنے ظرف کے مطابق فیض پاتا ہے۔

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی ولادت ۱۱۰۱ھ میں موجودہ ضلع حیدرآباد کی تحصیل ہالہ میں ہوئی۔ آپ کے والد سیّد حبیبؒ قصبہ ہالا حویلی میں رہتے تھے۔ شاہ عبداللطیفؒ کے آباء و اجداد سادات کے ایک اہم خاندان سے تعلق رکھتے ہیں آپ کا سلسلہ نسب حضرت علی کرم اللہ وجہ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچتا ہے۔ شاہ صاحب کی ولادت کے کچھ دن بعد ان کے والد آبائی گاؤں کوٹری میں آکر رہنے لگے۔ شاہ صاحب پانچ چھ سال کی عمر میں آخوند نور محمد کی مشہور درسگاہ میں حصول علم کیلئے بھیجے گئے۔ عام روایت کے مطابق شاہ صاحب نے الف کے سوا کچھ پڑھنے سے انکار کر دیا۔

اِک الف تیکوں درکار
علموں بس کریں اویار
اِک الف پڑھو چھٹکارہ اے
الف ہکو ہم بس وے میاں

مرزا مغل بیگ ارغون کوٹری میں سکونت پذیر تھے۔ شاہ حبیبؒ کی پاکبازی اور بزرگی سے متاثر ہو کر پورے خاندان کے ساتھ آپ کے مریدوں میں شامل ہو گئے۔ ایک مرتبہ مرزا مغل بیگ کی نوجوان بیٹی سیدہ بیمار ہوئی حسب معمول شاہ حبیبؒ کے پاس ملازم بھیجا گیا لیکن چونکہ شاہ حبیبؒ کی طبعیت ناساز تھی آپ نے اپنے نوجوان بیٹے کو ملازم کے ساتھ روانہ کیا۔ مرزا پہلے چونکا پھر سوچتے ہوئے

Scanned with CamScanner

کہ پیر و مرشد کا فرزند ہے زنان خانے میں لے گیا جب لڑکی کی کلائی شاہ کے ہاتھ میں آئی تو آپ کی زبان سے بیساختہ جملہ نکل گیا۔

''جس کا ہاتھ سیّد کے ہاتھ میں آجائے اس کے لئے درد دکھ کیسا۔''

عام روایت ہے کہ یہ سن کر مغل بیگ بدظن ہوا اور شاہ حبیب کو کوٹری چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

۱۱۲۵ھ میں دل قبیلہ کے بعض سرکش لوگوں نے مرزا مغل بیگ کی حویلی پر حملہ کیا، مغل بیگ کے خاندان میں جتنے بھی مرد تھے سب قتل کر دیے گئے صرف ایک نوعمر لڑکا اور عورتیں باقی رہ گئیں۔ انہوں نے سوچا کہ یہ تباہی و بربادی سیّدوں کی ناراضگی اور بددعا کی وجہ سے ہے شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر سب نے دست بدست معافی مانگی اور مغل بیگ کی صاحبزادی سیّدہ کو شاہ لطیف کے نکاح میں دینے کا اقرار کیا۔ ازدواجی رشتے میں منسلک ہونے کے بعد شاہ نے کوٹری سے چار پانچ کوس دور ایک غیر آباد جگہ کو اپنا مسکن بنا لیا۔ اس پُر فضا جگہ کو اب تک ''بھٹ شاہ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

''رومی و شیکسپیئر ہو یا شاہ بھٹائی ان کی تخلیقات لازوال ہیں۔''

آپ کے کلام سے معلوم پڑتا ہے کہ آپ کو دینی علوم پر عبور تھا اور عربی و فارسی سے واقفیت رکھتے تھے آپ کے کلام میں وسعت ہے شاہ صاحب کا کلام واقعہ نگاری اور منظر نگاری سے بھی مزّین ہے۔ آپ کے کلام میں سندھ کے مختلف علاقوں کے مناظر بڑی خوبصورتی سے ملتے ہیں۔ آپ نے رومانوی داستانوں کے ذریعے زندگی کا اعلیٰ مقصد واضح کیا۔ آپ کی شاعری انسانی فطرت اور نفسیات کی بڑی باریک بینی سے عکاسی کرتی ہے۔

ترجمہ: شریعت کے راستے پر چلنے والے طریقت کے اسلوک طے کر کے معرفتِ حقیقت کی منزل کو پہنچ جاتے ہیں اور ملکوت و جبروت کی بھی منازل پا لیتے ہیں اس طرح وہ لاہوت سے گزر کر باہوت کی منزل پار کر جاتے ہیں۔

ایک جگہ شاہ صاحب کربلا کے واقعہ کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

ترجمہ: احمدؐ کا پیارا کربل جا رہا ہے سارا سامان لے کر سب کو چھوڑ کر کربل جا رہا ہے چاند اور سورج ڈوب چلے ہیں ہر طرف اندھیرا ہے تاریکی ہی تاریکی ہے نہ سورج ہے نہ چاند نہ تارا۔

شاہ صاحب نے اپنے کلام کو مختلف سروں میں ترتیب دیا۔ آپ نے سندھ اور ہند کے مشترکہ راگوں عربی اور ایرانی موسیقی کے راگوں کے ملاپ سے سندھی راگوں کے ایک نئے نظام کو جنم دیا۔ سندھ کی لوک داستانوں عمر ماروی، مومل رانو، لیلا چنیسر، سسی پنوں وغیرہ کو مستقل راگوں کا روپ دیا۔ شاہ صاحب کے کلام کو رسالہ کہا جاتا ہے۔

ترجمہ: تیرا محبوب تو تیرے قریب ہے اس کو باہر کیوں ڈھونڈتا ہے وہ تو تیری شہ رگ سے زیادہ قریب ہے۔

☆.....☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

غزل اور آزاد غزل

ناصر بشیر

غزل وہ صنف سخن ہے جس نے ہر عہد میں اپنا وجود منوایا۔ غزل گوئی کی ابتداء دکن سے ہوئی۔ اوّلین صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ نے اس دور میں غزل کہی جب شاعروں پر خارجیت کا غلبہ تھا۔ شعراء مرثیے، قصیدے، مثنوی اور اسی طرح کی دیگر اصناف میں دلچسپی لیتے تھے لیکن غزل نے تب بھی اپنا وجود منوایا حتیٰ کہ بیسویں صدی میں جب نظم نے نئی کروٹیں لیں نظم معریٰ نظم آزاد، سانیٹ، ہائیکو اور کنیٹوز کو شاعروں نے اپنی تخلیقی تجربہ گاہ بنایا لیکن وہ غزل کی نفی نہ کر سکے۔ یہ غزل کی کامیابی ہے کہ ابھی تک جدید دور کا ساتھ دے رہی ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر غزل میں ایسی کون سی بات ہے جس کے باعث یہ ہر دور میں زندہ رہی ہے؟ اس کے مقابلے میں ہر دور میں مختلف اصناف سخن رہی ہیں مگر پھر بھی غزل نے ہی ہمیشہ اُن پر غلبہ حاصل کیا؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ غزل ایک لچک دار صنف سخن ہے۔ جب ہم نظم اور غزل کا موازنہ کرتے ہیں تو دونوں میں ایک بنیادی فرق یہ نظر آتا ہے کہ نظم ایک بنیادی اور مرکزی خیال پر مبنی ہوتی ہے۔ نظم کے تمام استعارے ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں ہوتے ہیں چنانچہ قاری کو نظم میں بیان کئے گئے مفاہیم کی تہ تک اُترنے کے لیے غوطہ خوری کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اُسے تخلیق کار کے ساتھ ساتھ سفر کرنا پڑتا ہے۔ اُسے ایک مکمل یک سوئی درکار ہوتی ہے جو اسے معانی تک رسائی دلاتی ہے۔

پھر یہ کہ نظم کے اگر چند اشعار یاد کر لیے جائیں تو وہ معانی کی ترسیل نہیں کرتے البتہ اس کا مفہوم نثر میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ اس کے مقابلے میں جب ہم غزل کو دیکھتے ہیں تو اس کی ریزہ خیالی، اس کی سب سے بڑی خوبی بن کر سامنے آتی ہے۔ غزل میں کوئی ایک خیال مربوط انداز میں پیش کرنے کی گنجائش نہیں اور اگر ایسا کیا بھی گیا تو قاری نے اسے قبول نہیں کیا۔ کیونکہ قاری کے ذہن میں بھی غزل کا ایک تصور موجود ہے۔ وہ تصور جیسے وہ کسی بھی صورت تغیر آشنا نہیں کرنا چاہتا۔ ہم خواہ کتنے ہی جدّت پسند ہو جائیں مگر بعض معاملات میں روایات کا ساتھ دینے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ یہ ہماری جدّت پسندی ہے کہ ہم چاہے تقریب میں تھری پیس سُوٹ پہن کر جائیں لیکن روایت کا ساتھ دینے کے لیے لازم خیال کرتے ہیں کہ وہ لباس صاف ستھرا ہو۔ یہ روایت ہی تو ہے جو برسوں سے چلی آ رہی ہے۔

Scanned with CamScanner

روایت معاشرے کی تشکیل کردہ ہوتی ہے۔ جس چیز کو معاشرہ اپنا لے یا سے زیادہ لوگ پسند کریں، وہ روایت بن جاتی ہے۔ سو کپڑوں کی صفائی رکھنا بھی ایک روایت ہے اور اگر ہم اس روایت سے انحراف کریں تو معاشرہ ہم سے قطع تعلق کر سکتا ہے۔ یا کم از کم اپنی ناراضی کا اظہار کر سکتا ہے۔ سو غزل کی پسندیدگی میں بھی ہماری روایت پسندی کا عمل دخل ہے۔

اب تو غزل کا ایک عام قاری بھی جانتا ہے کہ (نظم کی طرح) غزل کا کوئی موضوع نہیں ہوتا۔ اب اسے یہ بھی معلوم ہے کہ غزل کا ہر شعر ایک الگ مفہوم لیے ہوئے ہوتا ہے۔ اس کے کان ایک خاص قسم کی غزل سننے کے عادی ہو چکے ہیں یہاں یہ بات یاد رہے کہ میں غزل کی ہیئت کی بات کر رہا ہوں۔ اس کے مضامین یا مفاہیم کی نہیں۔ یہ الگ بات کہ اصل اہمیت تو مظروف کی ہوتی ہے، ظرف کی نہیں۔ لیکن کبھی کبھی مظروف کے ساتھ ساتھ ظرف کی اہمیت بھی بڑھ جاتی ہے۔ اگر گندے گلاس میں ٹھنڈا اور میٹھا شربت پیش کیا جائے تو وہ بے مزہ ہوگا۔ اسی طرح اگر ایک فریم میں لگی ہوئی تصویر جاذب نظر اور دل کش نہیں ہے تو اس فریم کو دل کشی بھی جاتی رہے گی میں اس وقت غزل کے فریم کی بات کر رہا ہوں۔ ہم غزل کو اسی فریم میں دیکھنا چاہتے ہیں جس میں ہم اسے ہمیشہ سے دیکھتے چلے آ رہے ہیں اور اگر اس فریم کو ذرا سا بھی بدلنے کی کوشش کریں تو قاری کے اندر احتجاج پیدا ہو جاتا ہے۔ ہم تصویر کا فریم چھوٹا سا بڑا تو کر سکتے ہیں لیکن اس میں کوئی ایسی غیر معمولی تبدیلی نہیں کر سکتے جو تصویر کے حسن ہی کو مجروح کر کے رکھ دے۔ غزل کا حسن اس کی ریزہ خیالی اور مضامین کا تنوع ہے اگر غزل کے فریم کو ہم بدلنے کی کوشش کریں تو شاید اس کی ریزہ خیالی اور اس کے تنوع سے بھی دست بردار ہونا پڑے۔ رشید نثار لکھتے ہیں۔

''نشاۃ الثانیہ کے عہد میں غزل کے پاس مدافعت کا کوئی سامان نہیں۔ غزل کا اپنا چہرہ تھکا ہوا اور خزاں رسیدہ ہے۔ اسے دو بات بحال کرنے کے لیے اس کی ہیئت میں تبدیلی بے حد ضروری ہے تا کہ انسان دوستی اور عظیم روحانی تحریک میں نئے انداز سے اپنا کردار ادا کر سکے۔'' (''کچھ اُردو غزل کے بارے'' مطبوعہ ''اوراق'' دسمبر 1990ء)

وہ ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''غزل کو نظم کی پابند ہیئت ہی کی طرح لکھا جائے اور پیرا گراف تبدیل کر کے آزاد نظم کا مستعاری تجربہ کیا جائے تو غزل کی نئی ہیئت ابھر کر سامنے آ سکتی ہے۔'' (''کچھ اُردو غزل کے بارے میں'' از رشید نثار مطبوعہ ''اورق'' دسمبر 1990ء)

جب رشید نثار صاحب یہ کہتے ہیں کہ نشاۃ الثانیہ کے عہد میں غزل کے پاس مدافعت کا کوئی سامان نہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ موجودہ زمانے میں غزل کو بہت سے حریفوں کا سامنا ہے جن کا اسے مقابلہ کرنا ہے لیکن اس کے پاس مدافعت کا کوئی سامان نہیں۔ حالانکہ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ غزل کو کسی بھی دور میں مدافعتی سامان کی ضرورت پیش نہیں آئی کیونکہ اس سلسلے میں یہ پہلے ہی خود کفیل ہے۔ یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ غزل کو ہمیشہ ہی مقابلے کی فضا میں رہنا پڑا ہے۔ دکن میں غزل کے متوازی مرثیہ، قصیدہ، مثنوی

Scanned with CamScanner

اور مذہبی نظمیں کہی جاتی تھیں۔ شمالی ہند میں بھی قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، قطعہ، رباعی وغیرہ کا زور تھا مگر غزل کے پاؤں پھر بھی مضبوطی سے جمے رہے۔ لکھنؤ نے بھی غزل کے کئی بڑے شاعر پیدا کیے۔

بعد ازاں غالب نے غزل کو فلسفہ سے آشنا کیا۔ ان کے بعد حالی نے غزل میں قومی رنگ پیدا کیا اور اقبال نے غزل کو قومی اُمنگوں کا آئینہ دار بنا دیا۔ گویا انہوں نے تغزل کا مفہوم ہی بدل کے رکھ دیا تھا۔ یہاں یہ بات لائق ذکر ہے کہ اقبال نے غزل کے فریم کو نہیں چھیڑا بلکہ تصویر میں کسی حد تک تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اقبال کے بعد غزل کے بڑے شاعروں میں فراق گورکھ پوری، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، ناصر کاظمی، احمد فراز، منیر نیازی اور شہزاد احمد کے نام نمایاں نظر آتے ہیں۔ فی زمانہ شعرا کی ایک بڑی تعداد غزل کہہ رہی ہے چنانچہ کس بھی طرح یہ کہنا اور سوچنا درست نہیں کہ غزل کا چہرہ تھکا ہوا اور خزاں رسیدہ ہے۔ غزل کا چہرہ کس بھی دور میں تھکا ہوا اور خزاں رسیدہ نظر نہیں آتا بلکہ اس نے ہر دور میں اپنی تازگی کا بھرپور احساس دلایا ہے۔ غزل کے ساتھ انیسویں صدی میں جو اضاف پھل پھول رہی تھیں، آج ان کا نام و نشاں تک نظر نہیں آتا۔ غزل ہمیں آج بھی تازہ دم نظر آتی ہے کہ اس میں زندگی کی سی وسعت ہے۔ بظاہر یہ دکھائی دیتا ہے کہ غزل ایک اختصار پسند صنف ہے اور شاید حقیقت میں ایسا ہے بھی لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں بڑے مفاہیم نہیں بیان کیے جا سکتے میں غزل کو زندگی کے مماثل قرار دیتا ہوں کہ اس میں بھی وہ تمام دکھ، مسرتیں، چہرے، جذبات، رنگ اور موسم کھوئے جا سکتے ہیں جو زندگی کا حصہ ہیں۔ جُوں جُوں زندگی اپنی اقدار اور روایات بدلتی گئی، تُوں تُوں غزل نے بھی اپنا رنگ بدلا ہے۔ جب ہم غزل کی تاریخ کا سرسری جائزہ لیتے ہیں تو اس میں زندگی کا سفر دکھائی دیتا ہے۔ جو نشیب و فراز زندگی نے دیکھے ہیں، وہی غزل میں بھی نظر آتے ہیں۔ مثلاً دکن کی معاشرت میں میلوں ٹھیلوں اور مذہبی تہواروں کو ایک خاص مقام حاصل تھا چنانچہ اس دور کی غزل انہی موضوعات سے مملو نظر آتی ہے۔ جب غزل شمالی ہند پہنچی تو وہاں اسے زندگی میں ایک دوہرا پن نظر آیا۔ یوں تقریباً پچیس برسوں تک غزل کے مزاج میں ایہام بھی شامل رہا۔ جب دہلی ملیا میٹ ہوئی اور کرب و غم زندگی کا حصہ بنے تو میر تقی میر کی غزل نے جنم لیا اور اپنے عہد کی آواز بن کر تاریخ کا حصہ بن گئی۔ اسی دور میں تصوف نے بھی ایک بھرپور کروٹ لی تھی چنانچہ خواجہ میر درد کی غزل صوفیانہ خیالات کی تصویر بن گئی اس دور کی دہلی کے لوگوں کی نفسیات پر ایسے اثرات مرتب ہوئے کہ انہوں نے کرب و غم کو بُھلا کر ہنس کھیل کر زندگی گزارنا چاہی اس رجحان کی نمائندگی، مرزا رفیع سودا کی غزل کرتی ہے۔

غالب کے دور تک آتے آتے فکر و فلسفہ کو بھی زندگی کا حصہ تسلیم کر لیا گیا تھا سو ان کی غزل علت و معلول کے باہمی روابط کا ثبوت بن گئی۔ جب ضرورت محسوس ہوئی کہ اہل ہند کی اصلاح کی جائے تو اکبر اور حالی کی شاعری سامنے آئی۔ جب اس سلسلے نے زور پکڑا تو اقبال نے انگڑائی لی اور غزل کو ایک قومی اور اصلاحی رنگ دیا۔ انہوں نے غزل کو قومی اُمنگوں کی تصویر بھی بنایا اور تخلیقی تجربہ بھی بنایا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ غزل نے ہر دور میں زندگی کا ساتھ دیا اور کبھی، کسی موقع پر اس کا فریم چھوٹا یا تنگ محسوس نہیں ہوا اور نہ کبھی کسی

Scanned with CamScanner

شاعر نے غزل کے فریم کو تبدیل کرنے کی کوئی کوشش کی۔ غالب نے غزل کی تنگ دامنی کا شکوہ ضرور کیا لیکن انہوں نے بھی غزل کی ہیئت میں تبدیلی کی کوئی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے جو کچھ کہا، پرانے سانچے اور حدود و قیصر و میں رہ کر کیا۔

غزل کی مقبولیت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ریزہ خیالی کے باعث اس کے اشعار عام لوگوں کو بھی یاد رہ جاتے ہیں حتیٰ کہ ایک ناخواندہ شخص کو بھی غزل کا کوئی شعر یاد رکھنے کے لیے خاص تردد نہیں کرنا پڑتا۔ ایک اور بات یہ کہ غزل کا ہر شعر اپنی جگہ ایک مکمل اکائی ہوتا ہے جبکہ نظم کے تمام اشعار مل کر ایک اکائی بناتے ہیں۔ غزل کا شاعر اگر قدرت کلام رکھتا ہو تو وہ ایک ہی شعر میں فکر و فلسفہ کے دریا بہا سکتا ہے۔ یہاں میں ایک بات واضح کر دوں کہ غزل کا ہر شاعر، نظم گو پر فوقیت نہیں رکھتا یا یوں کہیے کہ ہر غزل کا ہر شعر گنجینۂ معنی کا طلسم نہیں ہو سکتا۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو غزل کے مخصوص مزاج کو سمجھتے ہیں اور اس کی روح کے مطابق شعر کہتے ہیں۔ غزل کو اگر کوئی نقاد خزاں رسیدہ کہتا ہے تو اس کا سبب وہ شاعر ہیں جو عجزِ اظہار کا شکار رہیں یا وہ لوگ جو غزل کے چور دروازے سے ادب کی دنیا میں داخل ہونے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جب بھی کوئی شخص میدانِ سخن میں وارد ہوتا ہے تو سب سے پہلے وہ غزل کہتا ہے۔ شاید اس کے خیال میں غزل کہنا آسان ہوتا ہے کہ اس کے لیے یک سوئی کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ پانچ چھے اشعار چلتے پھرتے بھی کہے جا سکتے ہیں اور پھر استاد کہلانے کے شوقین کسی شاعر سے ذرا سی اصلاح لینے کے بعد کسی رسالے یا اخبار میں چھپوائے بھی جا سکتے ہیں۔ آج کل غزلوں کے مجموعے دھڑا دھڑ شائع ہو رہے ہیں۔ ادبی جرائد اور اخبارات کے ادبی صفحات میں غزلیں سب سے زیادہ شائع ہوگی ہیں۔ مشاعروں میں چلے جایئے۔ ہر شاعر غزل سے آپ کو تواضع کرنے پر تیار نظر آئے گا۔ یہ صورت حال اگرچہ پریشان کن ہے، مایوس کن نہیں۔ کیونکہ ہر دور میں اچھے اور برے غزل گو رہے ہیں۔ وقت کی ریفائنری گندگی کو الگ کر دیتی ہے اور اچھے شاعروں کو الگ سے کھڑا کر دیتی ہے میں غزل کو آج بھی اسی لیے تر و تازہ خیال کرتا ہوں کہ اسے آج بھی بڑے شاعر میسر ہیں میں یہاں ان کے نام نہیں گنواؤں گا کیونکہ ان بڑے شاعروں سے ہم سب واقف ہیں۔ نئی نسل کے نمائندہ شاعر بھی توانا غزل کہہ رہے ہیں چنانچہ یہ کہنا کوئی مشکل بات نہیں کہ انیسویں اور بیسویں صدی کی طرح موجودہ صدی بھی غزل کی صدی ہوگی۔

ہمارے جو نقاد آج غزل کے چہرے کو تھکا ہوا اور خزاں رسیدہ قرار دے رہے ہیں ان کی نظر میں اب ضروری ہو گیا ہے کہ غزل کی ہیئت میں تبدیلی کی جائے تا کہ ان کے مطابق یہ صنف انسان دوستی اور عظیم روحانی تحریک میں نئے انداز سے اپنا کردار ادا کر سکے۔ ان کی سوچ سے یہ بات آشکار ہوتی ہے کہ غزل نے انسان دوستی اور عظیم روحانی تحریک کے ضمن میں کچھ نہیں کیا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس سلسلے میں جتنا سمجھ غزل نے کیا ہے اتنا کسی اور صنف نے نہیں کیا۔ انسان، کائنات اور خدا شروع ہی سے غزل کے موضوعات رہے ہیں۔ ہر شاعر جو ذرا بھی سائنسی ذہن رکھتا ہے، وہ ان موضوعات سے انحراف کر ہی نہیں سکتا۔ انسان دوستی کی مثالیں تو ہمیں غالب کے ہاں بھی نظر آتی ہیں۔

Scanned with CamScanner

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں
کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں، پیالہ وساغر نہیں ہوں میں

بیسویں صدی کے شاعر بھی انسان دوستی کے معاملے میں پیچھے نہیں نظر آتے۔ خصوصاً ترقی پسند غزل گو شاعروں کے ہاں انسان دوستی کے موضوعات پوری تخلیقی آن بان کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ اگر میں یہاں ان کے اشعار کی مثالیں دینا شروع کروں تو شاید میرا یہ مضمون بہت طویل ہو جائے گا اس لیے مثالیں دینے سے احتراز کر رہا ہوں۔ اسی روحانی تحریک تو کیا اس سے مراد کوئی ایسی چیز ہے جو انسان کے داخل کے تاروں کو چھیڑے؟ تو اس سے بھی غزل کا دامن ہرگز خالی نہیں۔ غزل ابتدا سے آج تک داخلی تحرک کا باعث رہی ہے۔ غزل کی داخلیت اس کے تغزل کا حصہ رہی ہے۔ چنانچہ ہر عمدہ اور معیاری غزل پڑھتے ہوئے قاری کو یہ احساس رہا ہے۔

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

غزل، اہل تصوف کا آرگن رہی ہے اور آج بھی ہے۔ یوں غزل کی ہیئت کی تبدیلی کے لیے جو جواز پیش کیے گئے ہیں، بے کار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی لائق ذکر ہے کہ غزل وہ صنف سخن ہے جو دراصل ایک ہیئت کا نام ہے اور یہی ہیئت اس کی پہچان ہے۔ موضوع یا مضمون اس کی پہچان نہیں۔ نظم اور غزل میں یہی بنیادی فرق ہے۔ اگر ہم غزل میں سے مطلع، مقطع، ردیف، قافیہ نکال دیں تو باقی کیا بچے گا؟ یہ چیزیں نکال دینے سے اس کا فریم ٹوٹ جائے گا۔

ان مکمل حقائق کے باوجود غزل میں ہیئت کی سطح پر تجربہ کیا گیا ہے۔ مظہر امام نے آزاد غزل کی بنیاد رکھی۔ مناظر عاشق ہرگانوی نے ''اوراق'' جون جولائی 1989ء میں ''آزاد غزل کا لسانیاتی عمل'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں انہوں نے اک تجربے پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی مظہر امام نے ایسا اس لیے کیا کہ غزل کے شاعر مصرعوں کو مساوی الوزن کرنے کے لیے عام طور پر الفاظ کی ترتیب بدل دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے دو ایک مثالیں بھی دی ہیں۔ جن سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ لفظوں کی ترتیب بگاڑ کر مصرعوں کو مساوی الوزن کر دیا جاتا ہے۔

گویا ان کے نزدیک یہ غزل کی ہیئت کی ایک خامی ہے۔ مثلاً

اے بتو! اس قدر جفا ہم پر نہ کرو بندۂ خدا ہیں ہم

انہوں نے نحوی ترتیب سے الفاظ یوں کر دیے ہیں:

اے بتو! اس قدر جفا ہم پر نہ کرو۔ بندۂ خدا ہیں ہم

Scanned with CamScanner

مجھے اس ترتیب پر اس لیے اعتراض ہے کہ شاعری کا خاص طور پر غزل کسی نحوی ترتیب کو تسلیم نہیں کرتی بلکہ مفہوم کی بہتر سے بہتر ادائی کے لیے شاعر جس لفظ کو جہاں رکھتا ہے وہ وہیں اپنے معانی کی ترسیل کرتا ہے۔ یعنی جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے اور اگر نحوی ترتیب آپ کو بدلنا ہی ہے تو جملے کے دو حصے کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ پھر آپ اسے نثر ہی میں کہیے۔

غزل کا ایک اور وصف ہے جو اسے دوسری اصناف سخن سے ممتاز کرتا ہے وہ ہے غنائیت۔ غزل کی بحروں میں روانی پائی جاتی ہے جس کے باعث غزل کو سُروں میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ اس کے مصرعوں کا مساوی الوزن ہونا بھی اسے موسیقی سے قریب تر کرتا ہے۔ جبکہ آزاد غزل کے اب تک جتنے بھی تجربے کیے گئے ہیں، ان میں یہ صلاحیت نہیں کہ انھیں موسیقی کے زیر و بم میں قید کیا جا سکے۔ پھر یہ کہ آزاد غزل کا تجربہ آج کافی پرانا ہو چکا ہے لیکن ابھی تک اس میں کوئی بڑا شاعر پیدا نہیں ہو سکا۔ اگر اس تجربے میں ذرا سی بھی جان ہوتی تو آج اس کے باعث کئی بڑے شاعر سامنے آ چکے ہوتے۔ اگرچہ آج کے دور کو آزاد روی اور ضابطوں، قاعدوں سے فرار کا زمانہ قرار دیا جاتا ہے اس کے پیش نظر خیال تھا کہ آزاد غزل کا تجربہ کامیاب ہو گا لیکن نہیں ہوا۔

صرف ادب ہی نہیں، فنون لطیفہ کے تمام شعبوں میں آزاد روی اپنائی جا رہی ہے۔ موسیقی، کلاسیک سے دامن چھڑا کر پاپ موسیقی کا لبادہ اوڑھ رہی ہے۔ مصوری، تجرید کی طرف بڑھ رہی ہے۔ رقص میں ڈسکو کی آمد آزاد روی کی علامت ہے۔ پابند شاعری کے ساتھ ساتھ نثری شاعری بھی ہو رہی ہے۔ غرض یہ کہ مروجہ اصول ضابطوں سے روگردانی عام روشن بن چکی ہے۔ اس آزاد روی کو ایک بڑا گروہ سنبھالنے کی کوشش کر رہا ہے اور اس کا بھرپور دفاع کر رہا ہے۔ لیکن یہ امر حیران کن ہے کہ جب غزل کو آزادی دلانے کی کوشش کی گئی تو یہ عمل ناکام ہو گیا۔ بہت کم لوگوں نے اسے اپنایا اور یہ بات بھی لائق ذکر ہے کہ یہ تجربہ اوّل اوّل بھارت میں کیا گیا۔ ہمارے ہاں چند ایک شاعروں نے آزاد غزل کہنے کی کوشش کی مگر وہ سنجیدگی اور تسلسل کے ساتھ اس تجربے کا ساتھ نہ نبھا سکے۔

مناظر عاشق ہرگانوی نے جن آزاد غزل گو شاعروں کی مثالیں دی ہیں ان میں سے بیش تر کا تعلق بھارت ہی سے ہے۔ گویا اس بیش تجربے کے فروغ کے سلسلے میں اگر کوئی کام ہوا ہے تو وہ بھارت میں ہوا ہے۔ پاکستان کے شاعروں نے اس انوکھے اور غیر فطری تجربے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ میں ادب میں تجربوں کا مخالف نہیں۔ یہ صدی تبدیلیوں کی صدی ہے۔ ہر شعبۂ زندگی میں تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ غزل کے فطری تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے کچھ شعراء اس میں تبدیلیاں لانے کی کوشش کر رہے ہیں اور نئے نئے تجربے کر رہے ہیں۔ بعض شعراء بحور کے تجربات کر رہے ہیں۔ ایک آدھ رکن کے اضافے یا کمی سے وہ نئی بحریں تراش رہے ہیں۔ بعض شعرا ردیف کے نہایت عمدہ تجربے کر رہے ہیں۔ یہ بھی تو ایک تجربہ ہی ہے کہ بعض شاعر مطلع ہی میں (مقطع کی طرح) اپنا تخلص استعمال کر رہے ہیں۔ لسانی سطح پر ہمارے بہت سے شاعر تجربات کر چکے جن سے ادب کا ہر قاری بخوبی آگاہ ہے۔ موضوعاتی سطح پر تو غزل ہمیشہ سے ایک تجربہ گاہ رہی ہے۔ ان تجربات کی موجودگی میں غزل میں آزاد غزل کا تجربہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں رہ جاتی جب

Scanned with CamScanner

میں نے مارچ 1991ء کے ماہنامہ علامت لاہور میں جیلانی کامران کی یہ نظم پڑھی تو وجہ سمجھ میں آ گئی کہ ہمارے ہاں آزاد غزل کا تجربہ کیوں ناکام ہو گیا۔

کوئی لفظ میرے نصیب کا قری سمت میری دعا بنے
مرے دل کو قدرے سکوں ملے
جو ہوا زمانے کے ساتھ ہے وہ خوشی کی تازہ ہوا بنے
وہ مقام آئے تو کیا کہوں؟
وہ ہوا چلے تو میں اپنی دنیا میں کیا رہوں؟
جو زمیں کے چہرے کی خاک ہے
میں اسے کہانی کا نام دوں؟
اسے موسموں کی زبان میں نئی منزلوں کا سلام دوں
جسے اوج کہتی ہیں پستیاں
اسے آرزو کا پیام دوں!
یہ کہوں.....
کہ بادِ صبا نے کل جو پیام لایا تھا کیا ہوا؟
جو سلام بھیجا تھا دور سے وہ سلام آیا تھا کیا ہوا؟
جو قیام پایا تھا کیا ہوا؟
جو تری جناب کی بات ہو وہ بنے تو تیری صدا بنے

کیا اس نظم میں وہی تجربہ دکھائی نہیں دیتا۔ تو بھارت میں آزاد غزل کے نام پر کیا گیا۔ بجا کہ اس نظم کو ہم مکمل طور پر آزاد غزل نہیں کہہ سکتے لیکن یہ آزاد غزل کے قریب تر ہے۔ ہمارے بہت سے شاعر آزاد نظم میں یہی کام کر رہے ہیں۔ وہ آزاد نظم میں ردیف تا ہیے کا اس طرح استعمال کر رہے ہیں کہ اس پر آزاد غزل کا گمان گزرتا ہے۔ میرا کہنا یہ ہے کہ اگر یہی ہیئت آزاد نظم میں سہولت کے ساتھ برتی جا سکتی ہے تو اس کے لیے غزل کے بنے بنائے سانچے کو توڑنے کی کیا ضرورت ہے؟

☆☆☆☆

Scanned with CamScanner

امن کے امکانات

پروفیسر نبیلہ کیانی

بہت سال بیتے ہمارے گھر میں ایک رسالہ چین با تصویر آیا کرتا تھا۔ اس میں تصویروں کے ساتھ ایسے مضامین بھی ہوتے تھے جن کو پڑھ کر یہ احساس ہوا تا تھا کہ اپنے عوام کو بہتر سے بہتر کرنے کے لیے حکومت کتنے مختلف طریقے استعمال کر رہی ہے۔ وہ صرف اُن کی روزمرہ زندگی کو ہی بہتر کرنے میں مصروف نہیں ہے بلکہ اُن کی ذہنی، روحانی اور جسمانی بالیدگی پر بھی زور دے رہی ہے۔ ایک مضمون جو میرے دماغ پر ابھی بھی نقش ہے وہ ایک ٹرین کے بارے میں تھا جو کینٹن سے شنگھائی جا رہی تھی۔ اس ٹرین میں بسیرا بھی تھا۔ جب صبح صادق ہوئی تو اُس ٹرین کو روک دیا گیا اور سب مسافروں سے کہا گیا کہ وہ ٹرین سے نکل کر باہر جائیں، طلوع آفتاب کا خوبصورت منظر دیکھیں۔ تازہ ہوا میں سانس لیں۔ ہو سکے تو ہلکی پھلکی ورزش بھی کر لیں۔ یہ سب کچھ ممکن بنوا کر ٹرین بیس منٹ کے بعد اپنے مسافروں کو لے کر سفر پر روانہ ہو گئی۔ گراں خواب چینی کیسے اپنی گراں خوابی سے سنبھلے یہ ایک چھوٹا سا مضمون اس سوال کے جواب میں بہت کچھ کہہ رہا ہے۔

جب ریاست اپنے شہریوں کی کچھ بُری عادات ترک کرنے میں ان کی مدد کر رہی ہو تو بہت ساری ذہنی اور جسمانی عادتیں تاریخ کے قبرستان میں دفن ہو جاتی ہیں اور نئی مگر صحت مند عادتیں فروغ پا رہی ہوتیں ہیں۔ اگر اچھی عادت کی وضاحت کی جائے تو شائد ایک تعریف یہی ہے کی وہ عادات جو انسان کو خوشی، تعمیر اور تخلیق کی طرف لے جائیں۔ اسے منفی جذبات اور تعصّبات سے نکالیں اور یہ اچھی عادات انسان کو اُن بُری عادات سے نجات دلانے میں معاون ہوں جو انسانی عشمت و توقیر میں کمی کا باعث بنتی ہیں۔ اس ضمن میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ عادات اسے وہ سمجھ، صاحیت اور طاقت بخشیں کہ انسان اپنے وہ روّیے اور ذہنی عادتوں کو بھی ترک کر سکے جنہیں اُس نے مقدّس سمجھ کر اپنا رکھا ہے، سو اچھی عادتوں می سب سے بہتر عادت ترک کرنے کی عادت ہے۔

ریاست کا ایک اہن کردار انسانوں کو بہتع انسان بننے مین مدد فراہم کرنے ہونا چاہیے جس کی ایک مثال چین کی ریاست ہے۔

Scanned with CamScanner

انفرادی سطح پر مہاتما گاندھی نظر آتے ہیں جنہوں نے برصغیر میں کوشش کی اپنی زندگی اسی کوشش میں بسر کردی کہ لوگوں کو وہ عادتیں ترک کرنے میں مدد دیں جن کی تائید مذہب کی ایک پسماندہ شکل کر رہی ہے، جیسے کہ شودر کی بطور ایک طبقے کے تخلیق اور پھر اُن سے نفرت۔ مہاتما گاندھی نے اپنی زندگی اس عادت کے خلاف لڑنے میں بسر کردی۔ برصغیر کی تاریخ میں چند اور نام بھی ہیں جنہوں نے پسماندہ روّیوں سے انسان کی نجات ممکن کرنے کی کوشش کی۔ اس ضمن میں اشوک کا نام بہت نمایاں ہے۔ اسی طرح گوتم بدھ ایک شاندار کوشش کا نام ہے۔ اشوک نے جب امن کا پرچم لہرایا تو امن کے بارے میں اس کے اقوال ہر طرف پھیل گئے۔

ان مثالوں اور کرداروں سے ایک بات تو تقریباً ثابت ہو رہی ہے کہ دنیا میں امن چاہیے، اور خاص طور پر برصغیر میں، تو سوچ کے دھارے سے بدلنے ہونگے۔ سوچ کے دھاروں کو بدلنے کیلئے ہمیں سب سے پہلے زبان پر کام کرنا ہوگا۔ زبان انسان کو بہت سارے جذبات اور خیالات کی تخلیق میں مدد دیتی ہے۔ چنانچہ ہمیں زبان میں سے وہ لفظ خارج کرنے ہونگے جو جنگ کو نہ صرف جائز قرار دینے میں معاون ہیں جنگ کو ایک شاندار فیصلہ اور انتخاب کے طور پر پیش کرتے ہیں، ایسا انتخاب جس میں یہ زندگی تو سنور ہی رہی ہے آنے زندگی میں بھی بہت سے خوبصورت امکانات ہیں۔ جہاد، شہید، غازی، جنگی ترانے اور زمیے، یہ اس اور اس کے علاہ بھی بہت کچھ زبان اور ڈکشنری سے خارج کرنے پڑیں گے تا کہ آئندہ نسلوں کو کبھی پتہ نہ چلے کہ بزرگ انڈوں کے چھلکوں پر جنگ جیسی بربریت میں ملوث رہے ہیں۔

زبان پر کام ہوگا تو انسان کی نفسیاتی شکلوں میں تبدیلی ممکن ہوگی اور نفسیاتی شکلوں میں تبدیلی ہوگی تو ذہنی روّیوں اور شکلوں میں بھی تبدیلی ہوگی۔ ہم اپنے بارے میں کیا سوچتے ہیں، اپنے آپ کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہم دھرتی کو کیسے دیکھیں۔ آسمان کو کیسے دیکھیں، جہاں ہمیں رات کو بے شمار ستارے جلملاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جہاں چاند گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ جہاں آفتاب پوری آب و تاب سے طلوع ہوتا ہے اپنی زندگی پرور کرنیں زمین پر نچھاور کر کے جھلمل جھلمل غروب ہو جاتا ہے۔ ہم نئے علم کیسے پیدا کریں۔ نئے دریافت شدہ علوم سے کیا رشتہ قائم کریں۔ اسے انسانوں کی بہتری کیلئے کس طرح استعمال کریں۔ اس سب کا تعلق نفسیاتی تعمیر سے ہے جو زبان کرتی ہے۔

ایک ناول کا آغاز کچھ یوں ہوا تھا کہ دست بدست لڑائی ہوا رہی ہے جس میں اسلحہ کا ستعمال بھی ہو رہا ہے۔ ایک سپہ سالار ریت کے ٹیلے پر کھڑا ہوا کر اپنی فوج کو دوبین سے دیکھ رہا ہے۔ اس نے دیکھا کہ ایک نوجوان سپاہی گھبرا کر سپہ سالا کی طرف بھاگا ہوا آ رہا ہے۔ سپہ سالا نے کہا آؤ میرے بہادر سپاہی۔ محاذ سے کیا خبر لائے ہو۔ بہادر سپاہی نے کہا بہادری گئی جہنم مین اور لعنت ہو اس بہادری پر، وہ سب تو ایک دوسرے کو ہلاک کر رہے ہیں۔ لفظ بہادری بھی ہلاکت کے کلچر (culture of killers) میں اور معنی دے رہا ہے اور non-killers کے کلچر میں مختلف انداز میں استعمال ہو رہا ہے۔

تخصیص مذہب، رنگ، نسل، قومیت مانندِ آفتاب انسانیت پر زندگی پرور نور افشانی کی۔ جنہوں نے انسانوں کی بیماریوں اور دکھوں میں کمی کرنے کی کوشش کی۔ جنہوں نے اپنے سائنسی، ادبی اور فنی شاہکاروں سے انسانوں کی خوشی میں اضافہ کیا۔ انسان کی تخلیقی قوت میں اضافہ کیا۔ انسان کی فرصت میں اضافہ کیا تا کہ انسان زندگی کی روزمرہ مصروفیات ہی پوری کرتے کرتے خرچ نہ ہو جائے بلکہ

Scanned with CamScanner

اپنے بارے میں، اپنی دھرتی اور اپنی کائنات کے بارے میں بھی سوچ سکے اور ایسی تہذیب پیدا کر سکے جو بقول Mill انسان کو راحت فراہم کر سکے، علم کو فوغ دے سکے، تو توہمات نکا خاتمہ کر سکے۔ ایک دوسرے کو خواہ وہ ایک دوسرے سے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں آپس میں ملنے جُلنے کا موقع اور سلیقہ فراہم کر سکیں۔ تنازعوں کو ختم کر سکے۔ طاقتور کا کمزور پر ظلم ختم کر سکے اور ان شاہکاروں سیکھ سکے جو اس گلوب پر انسانوں کا ایک بہت بڑا حصہ تخلیق کر رہا ہے۔ تا کہ تہذیبیں ایک دوسرے کو ختم کرنے کی بجائے سب تہذیبیں باہمی طور پر منور اور روشن ہوں۔ انسان اس دھرتی پر اور پوری کائنات میں جو بھی کارنامے سرانجام دے رہا ہے، ایک دوسرے کے تعاون سے ہی ممکن بنا رہا ہے۔ مختلف تہذیبوں کا مقصد یہ ہے اور ہونا چاہیے کہ انسان کی بہترین صاحیتیں اس کے شاندار مستقبل کیلئے استعمال ہوں نہ کہ انسان کی تباہی و بربادی کیلئے۔

یونانی تہذیب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ تہذیب دو ستوں پر کھڑی تھی۔ پہلا ستون علم سے محبت اور دوسرا ستون حسن سے عشق تھا۔ یونانی صاحبِ دانش کی حسن دیکھنے اور تلاش کرنے کی صلاحیت نے آج بھی ہمارے دلوں میں اُسے زندہ رکھا ہوا ہے۔ آج بھی علم کی ہر شاخ کی پہلی تعریف یونانی صاحبِ دانش ہی کی ہوتی ہے۔ یونانی دانشور آج بھی دانش کے ہر سفر کا نقطۂ آغاز ہیں اور ہمقدم بھی۔ نئے لفظ بھی اپنی بنیاد کم و بیش یونانی زبان میں ہی رکھتے ہیں۔ یونانی تہذیب اور یونانی زبان کا آپس میں بہت گہرا رشتہ تھا۔ یونانیوں میں یہ صاحیت بھی تھی کہ اپنے ہر نئے تجربے کیلئے ایک نیا لفظ coin کر لیتے تھے اور تہذیب ایسی تھی کہ انسانی ذہن کو نئے تجربات اور نئی دریافت کا موقع فراہم کرتی تھی اور یہاں نئے تجربے اور نئی دریافت کی سزا موت نہیں تھی۔ وہاں سقراط کی موت ایک exception ہے۔ امن رہتا تو یہ تہذیب انسانوں کی ترقی میں معاون ثابت ہوتی۔ انسانوں نے خون ریزی اور جنگوں میں وقت کا جو زیاں کیا ہے اس وقت کو انسان کی بہتری کیلئے استعمال کرتے۔ انسان کے دُکھ اور عذاب کم ہو جاتے۔

انسان کے حواس جیسے دیکھنا، سننا، سونگھنا، چکھنا، چھونا، محسوس کرنا، آرزو کرنا، خواب دیکھنا، خیالات تخلیق کرنا اور عمل کرنا، یہ سب حواس انسان کی انفرادیت کو ترقی دے رہے ہیں۔ وہ ترقی جس میں اس کا ضمیر زندہ ہے۔ اسکی تخلیق زندہ ہے۔ اسکی محبت زندہ ہے۔ جبکہ جنگ اور جنگی جنون انسان سے یہ سب کچھ چھین کر اسے ایک وحشت و درندگی میں لے جاتا ہے۔ ایک فلاسفر نے کہا تھا کہ وہ تہذیب تہذیب نہیں کہلا سکتی جو انسانوں سے دماغ جیسی شاندار طاقت چھین کر اس کی جگہ محض خوراک تلاش کرنے والی تھوتھنی فِٹ کر دے۔۔ محض خوراک تلاش کرنے والی اس تھوتھنی نے جنگ و جدل کے کیسے خوفناک مناظر پیش کئے ہیں ان سے جنگوں کی تاریخ بھری پڑی ہے۔ خوراک تلاش کرنے والی اس تھوتھنی کو امن کی خاطر اور امن کیلئے دل اور دماغ سے replace کرنا ہوگا۔ امن کی اقدار کے نام پر پہلا قدم کہیں بھی اُٹھایا جا سکتا ہے۔

یادوں کی بارات میں جوش ملیح آبادی نے لفظوں سے ایک پینٹنگ بنائی ہے۔ ''چونکہ وہ جنگِ عظیم کا زمانہ تھا فوجی گاڑیوں تک کسی کو جانے نہیں دیا جاتا تھا۔ اس لئے بڑے شش و پنج کے عالم میں یہ سوچتا ہوا بیٹھا رہا کہ اگر کسی نے دیکھ لیا تو جاسوسی کے جُرم میں کھڑے کھڑے گولی ماردی جائے گی یا گرفتار کرلیا جاؤں گا۔ خدا خدا کر کے انجن نے سیٹی دی اور میں لپک کر گارڈ کے پیچھے بمپر پر بیٹھ گیا۔ گاڑی کی رفتار تیز ہوئی تو میرے جسم کا توازن بگڑنے لگا۔ اتنے میں یورپین گارڈ نے پیچھے کی کھڑکی کی کھول دی۔ مجھے بیٹھا دیکھ کر وہ

Scanned with CamScanner

اُچھل پڑا۔ پستول جیب سے نکال کر تالیا اور ڈپٹ کر پوچھا۔ who id there?۔ میں نے بڑی مردانہ آواز میں کہا،
shut up that is love affair. a am going to my beloved.۔ گارڈ اگر ہندوستانی ہوتا تو ٹھائیں سے گولی مار دیتا۔ مگر وہ انگریز فوجی منچلا انگریز تھا۔ میرا یہ مردانہ جواب سُن کر اس نے کہا brave اور دونوں ہاتھوں سے مجھے اندر کھینچ لیا۔ اس نے لالٹین اُٹھا کر غور سے میرا منہ دیکھا اور مسکرا کر کہا۔ "Oh! an exat lovers face"(ارے! بالکل عاشق کا چہرہ) اور پھر بڑی نرمی کے ساتھ اس نے کہا please sit down lover(بیٹھ جایئے مسٹر عاشق، میں بھی عاشق ہوں)۔ میں بیٹھ گیا تو اس نیک مرد نے مجھ کو بیئر پلائی، بُھنا ہوا گوشت کھلایا اور جب میرا اسٹیشن آ گیا تو میرے ساتھ آ کر مجھ کو گیٹ سے باہر نکال دیا"۔

لفظوں سے بنی یہ تصویر ہمیں بہتسے پیغام دے رہی ہے۔ شاہد کہہ رہی ہے کہ محبت کی گنجائش اور قدر اسلحہ سے بھری ہوئی ٹرین بھی ممکن ہے۔ محبت حاکم اور محکوم کے روّیوں میں بھی تبدیلی ممکن بنا سکتی ہے۔ محبت نسل، مذہب، رنگ اور قومیت کے منفی جنون بھی ختم کر سکتی ہے۔ اور پینٹنگ شائد یہ بھی کہہ رہی ہے کہ ہمیں جلدی کرنی ہوگی اور اسلحے سے بھری ٹرین کو روکنا ہوگا اس سے پہلے کہ یہ ٹرین اپنا کام کر جائے اور انسان جیسے شاہکار کو جیسے فطرت نے صدیوں کی محنت کے بعد تخلیق کیا ہے خاک میں ملا دے۔

☆☆.....☆☆☆.....☆☆

Scanned with CamScanner

ایٹ وڈ اشاھین مفتی

ایک ایسی نظم جو کبھی نہ لکھی جا سکے

یہ وہ جگہ ھے جس کے بارے میں تم کبھی نہ جان سکو گے
کبھی تم اس کے باسی ھو گے
ایک ایسی جگہ جس کا تم تصور بھی نہ کر سکو گے
بلاخر تمہیں یہیں شکست ہو گی
جہاں لفظِ، کیوں، کپکپاتا ہے اور اپنے آپ کو خالی محسوس کرتا ہے
یہ کال ہے
جس کے بارے میں نظم نہیں لکھی جا سکتی
یہ ریت کی قبر ہے جہاں ان گنت دفنائے گئے اور پھر ان سے زمین بھی چھین لی گئی
ان کے جسموں پر اس نا قابل برداشت اذیت کا ٹھپہ لگا ہے
یہ پچھلے برس نہیں ھوا، نہ ہی چالیس سال پہلے، صرف پچھلے ہفتے
اور اب یہی ہو رہا ہے، ھوتا چلا جا رہا ہے
ہم نے ان کیلیے اسمائے گرامی کا طومار باندھا اور تسبیح کے دانوں کی طرح
ان کا ورد کیا، ہم نے انہیں اعداد و شمار میں تبدیل کر دیا اور اسی طرح کی
دوسری نظموں مین
کچھ کام نہ آیا، وہ وہی رہے جو وہ ہیں
عورت سیمنٹ کے گیلے فرش پر پڑی ہے، ایک لازوال روشنی کے نیچے
اس کے بازوؤں میں سوئیاں کھبی ہیں تا کہ اس کا ذہن ماؤف کیا جا سکے
انہیں اس کے مرنے پر حیرت ہے، ایک موت جو زندگی سے مشابہ ہے
وہ مر رہی ہے کیونکہ وہ بولی، وہ اپنے الفاظ کے باعث مر رہی ہے
یہ اس کا جسم ہے خاموش اور ساکت جو بغیر انگلیوں کے نظم لکھ رہا ہے
یہ سب کچھ اپریشن سے ملتا جلتا ہے، لیکن یہ اپریشن نہیں، پھیلا ہوا جسم،
بہتا ہوا خون اور آواز کی غراہٹ اسے پیدائش میں تبدیل کر رہی ہے
جزوی طور پر یہ ایک ملازمت ہے اور مہارت کا مظاہرہ بھی، ایک ڈرامہ
جسے بھدے پن سے بھی کہا جا سکتا ہے اور سلیقے سے بھی، وہ اپنے آپ
کو تسلی دیتے ہیں
جزوی طور پر یہ آرٹ نہیں
اس کائنات کی سچائیاں صاف صاف دکھائی دے رہی ہیں
آنسوؤں کے اندر سے
پھر مجھے کیوں بتایا جا رہا ہے کہ میری آنکھوں میں کچھ خرابی ہے
صاف صاف دیکھنے کیلیے بغیر پلک جھپکائے، نظر ھٹائے
کھلی آنکھوں کہ دو انچ سورج کے فاصلے پر کھلا رکھنا
کتنا بڑا عذاب ہے
وہ پوچھتے ہیں، پھر تمہیں کیا نظر آیا؟ بھیانک خواب، پرچھائیں
ہیولیٰ یا صرف اشتباہات
تمہیں کیا سنائی دیا
آنکھوں کی پتلی کے آر پار تیز دھار بلیڈ گھومتا ہے
کسی پرانی فلم کی تفصیلات کی طرح
گواہی دینے کی سزا برداشت کرنی ہو گی
گواہی وہی ہے جو سب برداشت کیا گیا۔

☆.....☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

ایٹ وڈ / شاہین مفتی

ایک نظم جو کبھی نہ لکھی گئی

ایک آدمی جنوبی ساحل پر چیل قدمی کر رہا ہے
دھوپ کی عینک لگائے، عمومی لباس میں
دو خوبصورت عورتوں کے ہمراہ
وہ اوزار بناتا ہے
پیروں کے ناخنوں کو جڑوں سے کھینچنے والے
دماغ اور نازک اعضاء کو بجلی کے جھٹکے دینے والے
وہ اس تجربے اور اذیت کا شاہد نہیں
وہ صرف بیوپاری ہے
میری عزیز خواتین!!!
وہ کہتا ہے
تم ان لوگوں کے بارے میں ہیں جانتی ہو، وہ اس کے علاوہ کچھ نہیں جانتے
آخر میں کیا کر سکتا ہوں
خاتون کہتی ہے
آخر وہ ان کی دعوت کیوں قبول کرتا ہے
وہ ان کا فریق کیوں ہے؟؟؟

☆.....☆☆☆.....☆

ڈاکٹر تقدیس زہرا

احساس

میں اپنے گھر کی چہار دیواری اونچی کر کے مطمئن ہوں
کسی دریچے، کسی بھی روزن سے
کوئی آواز نہ اٹھے گی
تمام درزوں کو بھر چکی ہوں
یہ اس لیے کہ مجھے خبر ہے.....
عدم تحفظ کا درد کیا ہے؟
کہ میں نے جی دار جسم و دل کو
لہو میں تبدیل ہوتے دیکھا
وہ آنکھیں جن میں تھے خواب زندہ، خیال زندہ
اُنھی کو تپتی ہوئی ہوا سے پگھلتے دیکھا
یہ ہونٹ جن کو پکارتے تھے
اُنھیں زمینیں نگل گئی ہیں.....!!
کہاں سے بادِ سموم آئی
چمن پہ جس نے اجاڑ ڈالے
ان آندھیوں نے میرے چمن کے
ہرے شجر بھی اکھاڑ ڈالے
مگر کسی نے کبھی یہ سوچا
کہ جن پرندوں کے گھونسلوں میں
دیوار و در کی جگہ ہوں تنکے
وہ کیا کریں گے.....؟
کہاں رہیں گے.....؟

☆.....☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

جاوید آفتاب

کون جانے کس لمحے

دل سے نکلنے والی دعا ابھی
وقت کے لمحوں میں قید ہے
خواب دیکھنا چھوڑ دیئے
زندگی ختم ہو جائے گی
یقین نہ رہے
امید ختم ہو جائے گی
احساس مٹ جائے
محبت ختم ہو جائے گی
کون جانے کس لمحے
دعا میں تاثیر ہو
جو تیرے دل میں اتر جائے
اور.....تو.....!
اپنی انا کے خول سے باہر نکل کر
اُن آنکھو میں چھپی
لازوال عشق کی عبارت کو پڑھ لے
جو ترا مقدر ہے

☆.....☆☆☆.....☆

سلیم الرحمٰن

GRAYMATTER کی قِلّت

چلو آؤ ذرا سی دیر کو
پیچھے کو چلتے ہیں
بس اتنی دور چلتے ہیں
جہاں پر قیمتی لمحوں کی قبریں ہیں
وہ لمحے
جنکے سینے میں
بُہت سے قولِ فیصل مُنجمد جسموں کی مانند ہیں
جہاں پر کتبۂ ذہنِ رسا بھی ایستادہ ہے
یہی سے فاصلہ بھی
کچھ زیادہ ہے
جہاں پر اک مریضِ کم شعوری کی بڑی بے نور مرقد ہے
کہ جس کے کاسۂ سر میں
GRAYMATTER کی قِلّت بین کرتی ہے

☆.....☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

☆جو کُھل نچ کھلوئی

روپ کی دھوپ ڈھلی تو پنگھٹ یاد آیا
مکھ کھڑکی میں رکھ کر
دیکھتے رہتے تھے
آنکھیں کب
واپس آتی ہیں
پیلے پیلے درد سندیسے
خواب کبوتر
سبز بنیرے پر رکھتے ہیں
چھت پر کاگ مسلسل
شور مچاتے جائیں
باغ میں ہجر کا کوئل گیت
نہیں سن پاتے
روئیں روئیں میں ایک چمابا در آیا ہے
یادوں کا گہرا کالا بادل
کل ہم جس کی رِکن مِن میں بھیگتے تھے
دیکھتے دیکھتے پھیکی پڑ گئی
چلتے دریا کی مسکان

مچھلی کائی اور چلی ہے
اوڑھ کے گھونگھٹ کان
ننگے جسم
دہائی دیتے سڑکوں پر نکلے ہیں
آگ دباتے
لانبو
دامن دامن
لپٹ لپٹ جاتے ہیں
لوگ نکل کر رقص میں آتے جائیں
ناچ نو نکلا ناچ
گیسو گیسو ایک دھمال
دائرہ دائرہ ڈھول کی تھاپ
ازلی دل میں پالا
کائی زدہ ملال
سرک سرک کر
دائرے سے باہر ہوتی خلقت
بارش بارش روئی

☆مادھو لعل حسین

Scanned with CamScanner

ڈاکٹر نبی آصف

ساعت گم ہے۔۔۔۔

(سال ۲۰۱۴ء کے لئے)

زندگی اتنی بھی آسان نہیں
لوگ چہروں سے یہاں کب کسے پہچانتے ہیں
کس کو ڈھونڈوں گی کہ مجھے اپنی بھی پہچان نہیں
ناشناسائی کے تاریک خرابوں میں یہاں
ہر قدم شورِ عدم
خامشی چار سو رقصاں کہ ساعت گم ہے
لب کی جنبش بھی فسانوں کی ہے تمہید یہاں
ہر نفس ضبط کی تاکید یہاں
اب تو احساس کے دامن میں کوئی خواب، نہ نغمہ، نہ صدا
میرے الفاظ درونِ زنداں
لگتا ہے عمر کی اس قید پہ خوش ہیں شاید
سال ہا سال اسی طور گزر جاتے ہیں

☆.....☆☆☆.....☆

ڈاکٹر نبی آصف

دسترس۔۔۔

اگر یہ دسترس میرے ادب کو بے کراں کرتی
میں اپنے گرد سب بکھرے ہوئے قصے بیاں کرتی

میں ان ساری فضاؤں میں ستارے ہم زباں کرتی
کبھی لہجے بدل دیتی کبھی سوچیں جواں کرتی

کبھی تاریک رستوں کو لہو سے روشنی دیتی
کبھی پھولوں کی شاخوں کو وفا کا آسماں کرتی

کبھی آنکھوں کی جھیلوں کو کسی کا امتحاں کرتی
کبھی اپنی محبت کے اکیلے پن کا غم کرتی

میں شب بھر جگنوؤں کی روشنی میں کچھ رقم کرتی
غموں کی بدگمانی کو ہمیشہ کم سے کم کرتی

میں زخموں پہ سجا دیتی اجالوں کی نئی کرنیں
تیرے قدموں میں رکھ دیتی سوالوں کی نئی کرنیں

☆.....☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

زبیدہ خانم.....ماہی موت دا سُنیہا دِتا گھل وے

(فنکارہ کی وفات پر لکھی گئی خصوصی تحریر)

پروفیسر سلیم الرحمٰن

دہائیاں بیت گئیں.....! یہ لاہور کے مشہور و معروف میکلوڈ روڈ کی بائیں جانب وہاں کی ایک جانی پہچانی اور معروف گلی سادات سٹریٹ ہے (لاہور ہوٹل والے ہاتھ پر ہوٹل سے چند فرلانگ آگے اسٹیشن کی جانب جاتے ہوئے) بہت کم سن ہوں جس دم توڑ چکا ہے۔ شام کے جھٹپٹے نے ابھی ذرا سنبھل سنبھل کر آنا ہے مگر پھر بھی ہلکی سی نامحسوس خنکی فضا میں تیرنے لگی ہے۔ جو موسم کے باقاعدہ تبدیل ہونے کی غمازی کر رہی ہے۔ یادداشت کم سنی کے باعث دھندلی سی ہے مگر اس Hazy memary میں بھی اُس سمے کے لمحات پتھر پر لکیر کی مانند متصل اپنا نقش بنائے ہوئے ہیں۔ یہ لکیریں وقت کے مدفن سے نکل کر ایستادہ ہو کر بولنے لگی ہیں.....بولنے لگی ہیں.....بولنے لگی ہیں.....جی آپ بھی مرے ساتھ ان سرگوشیوں میں تھوڑی دیر کے لیے اپنی سماعت گروی رکھ بیٹھے۔

گلی کے آغاز ہی میں داخل ہوتے ہوئے چند گز کے فاصلے پر دائیں جانب ایک بڑا ہی خوبصورت پرانی طرز کا بڑا سا مکان ہے۔ محرابیں، خوبصورت بالکونی رنگارنگ شیشے خوبصورت اور عالیشان رئیسانہ منظر پیش کرتا ہے۔ داخل ہونے سے پہلے بہت بڑا سا چوبی پھاٹک ہے۔ پھاٹک کھلا ہے۔ لوگوں کا ہجوم بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

آوازیں۔ جی گھٹتی بڑھتی آوازیں۔ چھوٹے بڑے بچے، بوڑھے، عورتیں، جوان مرد، سب اُس چوبی گیٹ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

آوازیں کانوں میں آ رہی ہیں۔

"..... اوئے..... اوئے ظریف مر گیا..... ظریف مر گیا..... اوئے ہوئے جوان ای سی۔ عمر تے کج وی نئیں سی، ایک اور آواز آئی۔" جواناں مرگ بیچارہ اُس کا ایک بچہ تو ابھی شیر خوار ہے۔ ذرا فاصلے سے ایک اور آواز آئی۔

Scanned with CamScanner

بڑے نصیب مرے۔

چند ساعتوں کے بعد اس طرح کی ایک اور مردانہ آواز آئی۔

ویری ہوا پیار میرا

بڑے نصیب مرے.....بڑے نصیب مرے

میں پریشان کن بھیڑ دیکھ کر گھبرا کر ذرا پیچھے ہٹ گیا۔ کچھ لوگ اور گاڑیوں سے اترے عورتیں مرد آئے اور پھاٹک کے اندر کھلے سے صحن میں پڑی ہوئی میت کے پاس چلے گئے۔ دوں نسوانی آوازیں گریہ آسا انداز میں وقفوں وقفوں سے بلند ہوتی تھیں۔

باہر کھڑے ہجوم سے آواز آئی۔

"..... یہ لیلیٰ ہے..... یہ..... یہ رونے کی آواز لیلیٰ کی ہے اور اور..... یہ زبیدہ خانم رو رہی ہے۔ یہ..... یہ آواز زبیدہ خانم کی ہے یہ ابھی ابھی آئی تھی یہ زبیدہ خانم ہے..... یہ..... یہ.....!

یہ عہد ماضی کی نامور اور مقبول ترین ہر دلعزیز مغنیہ زبیدہ خانم کے خوبصورت نام نامی سے میرا پہلا سماعتی تعارف تھا۔

وقت حسب معمول حکمرانی کرتا ہوا آگے بڑھ تھا۔ آگے اور آگے ایک سہ پہر گھر کے سارے افراد کہیں جانے کی تیاری کر رہے تھے.....سب میں ایک Excitment سی تھی۔ سادات سٹریٹ کی وسیع اور طویل گھر میں ہمارا Joint family Syspm تھا۔ کھسر پھسر کھسر پھسر سے پتہ چلا کہ دادا مرحوم سے چوری چھپے گھر کے تقریباً چھوٹے بڑے سب افراد فلم دیکھنے جا رہے ہیں مگر داد کے چیں بہ چیں ہونے اور اُن کی ناگواری روکے رکھنے کے لیے بہانہ یہ بنایا گیا کہ میرے تایا کی بڑی بیٹی کے اسکول میں ڈرامہ اسٹیج کیا جا رہا ہے سب لوگ یہ ڈرامہ دیکھنے جا رہے ہیں۔ سو دادا کا غصیلا غبار اٹھنے سے پہلے ہی بیٹھ چکا تھا کہ گھر کی کچھ ذہین خواتین کا یہ ناٹک کامیاب رہا تھا۔ خدا معلوم مجھے ساتھ کیوں نہیں لے جایا گیا شاید اور بھی ایک دو میرے ہم عمر بچے نہیں جا سکے تھے۔ بہر حال کچھ گھنٹوں کے بعد گھر کی خاموشی اور سناٹا ٹوٹا سب خواتین وحضرات (زیادہ تعداد خواتین کی تھی) واپس آتے اُن کے چہرے طمانیت اور مسرت کا سا سماں پیش کر رہے تھے اس طمانیت اور حصول مسرت کا پس منظر تب میں سمجھ نہ سکا تھا مگر وقفوں وقفوں سے مری تایا زاد بہنوں کے منہ سے یہ بول نکل جاتے تھے۔

جیوے ڈھولا ہو میرا جیوے ڈھولا جیوے ڈھولا ہو میرا جیوے ڈھولا

اور معاً یہ فقرہ بھی (اب اسے میں ڈائیلاک کہوں گا) زندان یادداشت سے مفرور نہیں ہوا۔

"ناجی ساڈی ایہہ تے ساڈی ہو کے روے گی....." یہ ایک مردانہ آواز تھی.....ایک اور کزن نے یہ دہرایا۔

"ناجی ساڈی ایہہ تے ساڈی ہو کے روے گی"

Scanned with CamScanner

واہ ناجی.....واہ!

ایک نسوانی آواز اس پر Overlap کر گئی۔

جیوے ڈھولا ہو میرا جیوے ڈھولا

ایک اور چچی کی آواز آئی۔

''ہائے ہائے کیڈی سوہنی اے صبیا (صبیحہ خانم)۔ بہت سوہنی ایہہ معلوم ہوا کہ یہ ابھی ابھی فلم ''ناجی'' دیکھ کر آئے ہیں۔ غالباً وہ پیراماؤنٹ سینما (بیرون بھاٹی گیٹ) میں لگی ہوئی تھی۔

ابھی ابھی پردہ سکرین پر صبیحہ خانم کے جمال کو ملاحظہ کر کے لوٹے تھے اور ان سب پر یہ نشہ جمال تر و تازہ تھا۔ اُس پر مستزاد اور زبیدہ خانم کا پُر گداز اور شریں گلا.....!

یہ میراز بیدہ خانم کی میٹھی، موثر، سُریلی، دلنشین آواز سے دوسرا تعارف تھا۔ مگر یہ گیت ابھی ریڈیو سے سماعت تک کا سفر طے نہیں کر پایا تھا۔ مگر چند ہی روز بعد آئے روز ریڈیو سے یہ سُریلا اور پر گداز گیت کانوں کو مسحور کرتا رہا اور آج تک میری سماعت پر آپ کی سماعت پر راج کر رہا ہے اور کرتا ہی رہے گا۔

ظریف مرحوم کی رہائش گاہ سے فرلانگ ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر سادات سٹریٹ ہی میں ہمارا آبائی گھر تھا۔ گلی میں ہفتے کے مختلف دنوں میں مختلف فقیر آیا کرتے تھے بعض مستقل آتے تھے اور بعض کا جوگی والا پھیرا ہوتا تھا۔

ایک بابا بہت مرعوب کُن شخصیت دراز قد، گھٹا ہوا جسم، سفید براق سی تہہ بند اور سفید قمیض، خشخشی سفید داڑھی، سفید نسبتاً بڑی مونچھیں، کھلتا ہوا گندمی رنگ، منڈا ہوا مگر سفید بالوں سے بھرا خشخشا سر ہاتھ میں اکتارہ۔ گھر گھر دروازے کے باہر کھڑے ہو کر اکتارے سے ہم آہنگ کر کے گلے سے دو آوازیں نکالا کرتا تھا۔ ایک کھوج سُر میں اور ایک گندھار میں۔

تیرے سبھے کم ہو جان ول وے بوہا چل کے حسین دا مل وے

پہلے مصرع ہی کھرج اور گندھار میں ہوتا یعنی ''تیرے سبھے کم'' کھرج میں اور ہو جان ول وے گندھار میں۔ سُروں کا انوکھا ملاپ دو آوازیں ایک موٹی ایک نارمل مگر کیا مجال کو اکتارے کے ساتھ ایک شُرتی بھی ادھر اُدھر ہو جائے۔

سبحان اللہ!

انوکھا اور صاحب اسلوب فقیر۔ اُس کے بعد نہ ایسا کوئی دیکھا نہ سنا۔ اُس وقت اُس کا اسلوب دیر تک اُس کے جانے کے بعد کانوں میں گونجتا رہتا اور گلی کے لڑکے بالے اُسی انداز میں دو آوازیں اُس کی نقل میں نکالتے رہتے تھے۔

ذرا سالوں بعد علم ہوا کہ اکتارہ لیے گانا بجایا جانے والا یہ نغمہ دراصل زبیدہ خانم کے اُن دنوں کے مشہور و معروف پر سوز و پر گداز

Scanned with CamScanner

اس نغمے کی طرز پر ہے۔

ماہی موت دا سینہا دتا گھل وے

اس دنیا توں دور دلا چل وے

انہی دنوں زبیدہ خانم کے جس نغمے نے دھومیں مچا رکھی تھیں وہ اپنے عہد کا مقبول ترین نغمہ جسے سدا بہار کہئے گا۔

آئے موسم رنگیلے سہانے جیا نہ ہی مانے

اور میں یہ بات پورے تیقن اور اعتماد سے کہوں گا کہ فلمی نغمات کی تاریخ میں راگی پہاڑی میں جتنے بھی نغمات موزوں کئے گئے (پاک و ہند کی فلموں میں) یہ اس گلشن پہاڑی میں سدا تر و تازہ رہنے والا گل شاداب ہے۔ رشید عطرے مرحوم کا تو ذکر ہی کیا کرنا کہ وہ بجائے خود ایک بہت بڑا موضوع ہے اور کن رسیے اور سر شناس اُن کے..... سامنے دست بستہ کھڑے دیتے ہیں۔ فلم ''سات لاکھ'' کا یہ گل تازہ ہمیشہ اپنی اہمیت اور حُسن و جمال کا اعتراف کرواتا رہے گا۔

باغوں میں پڑے جھولے..... خانصاحب اُستاد برکت علی خاں۔

آواز دے کہاں ہے دنیا میری جواں ہے۔ نور جہاں جی اور سریندر۔

چودھویں کا چاند ہو..... محمد رفیع اور ایسے ہی راگنی پہاڑی میں موزوں کئے گئے بہت سے نغمات کی فہرست تیار کی جائے تو بلاشبہ زبیدہ خانم کا گایا ہوا یہ گیت فہرست کے ابتدائی حصے میں از خود اپنی جگہ بناتا رہے گا۔

میں Full of Romantic Melonchoy کہا جاسکتا ہے یہ صاحب اسلوب فنکارہ نیلو کے لیے بھی خوش شگونی کے دروازے کھولتا چلا گیا تھا۔ زبیدہ خانم نے موسیقی کی باقاعدہ تعلیم کسی اُستاد سے حاصل نہیں کی تھی تاہم یہ بات سکہ بند ہے کہ دوسری بہت سے فلمی مغنیاؤں (منور سلطانہ سمیت) کی طرح اُن کی Basic Insiperation ملکہ ترنم نور جہاں ہی تھیں۔ پھر یہ کے فلم پاٹے خاں میں انہوں نے نور جہاں جی کے ساتھ اُن کی سہیلی اور سائیڈ ہیروئن کا کردار بھی کیا تھا۔ اسے زبیدہ خانم اپنے لئے عمر بھر ایک اعزاز سمجھتی رہی تھیں نور جہاں کے ذکر پر اُن کا یہ فقرہ کوزے میں سمندر لئے ہوئے ہیں۔

''میڈم کا تو جواب ہی نہیں۔''

ہمارے پیارے بزرگ دوست پروفیسر چوہدری محمد صدیق مرحوم و مغفور کا آبائی تعلق بھی شہر لگاراں۔ شہر فنکاراں اور شہر موسیقاراں امرتسر سے تھا۔ وہ اس خوش نصیب مغنیہ سے چند برس چھوٹے تھے۔ مجھ سمیت ہزاروں مداحین کی طرح وہ اس خوش گل مغنیہ کے بہت پرستار تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے بتایا تھا کہ امرتسر سے قیام پاکستان کے وقت زبیدہ خانم کا خاندان ہجرت کر کے لاہور آن بسا تو امرتسر کا ایک بابا (بخدا اب نام بالکل یاد نہیں رہا ہے) بھی اُس خاندان کے ساتھ ہجرت کر کے آیا تھا۔ وہ بذات خود بڑا سُریلا اور رسیلا

Scanned with CamScanner

تھا۔ وہ زبیدہ کی صاف شفاف گائیکی کو مزید نکھارنے کے لیے ان دنوں اس نوجوان لڑکی کو کچھ نہ کچھ بتاتا رہتا تھا اور بقول پروفیسر محمد صدیق امرتسری وہی بزرگ زبیدہ خانم کو ریڈیو لاہور تک پہنچانے والا تھا۔

واللہ اعلم بالصواب!

ابھی میں نے چند سطور قبل اس خوش گلو مغنیہ کے لیے خوش نصیب کے الفاظ استعمال کئے تھے۔ اُن کو خوش بخت اور خوش نصیب کہنے کے حوالے سے میں اپنے موقف پر قائم ہوں۔

محترمہ مغنیہ مرحومہ زندگی کے متنوع پہلوؤں کے حوالے سے بخدا بہت خوش نصیب واقع ہوئیں مثلاً یہ کہ جب اُن کے فنی کریر کا آغاز ہوا (فلم شہری بابو..... موسیقار، عطرے، شاعر، 1953ء) تو اُن کی پہلی ہی فلم کے دو نغموں نے دھوم مچادی اور پھر یہ سمجھئے کہ Over a night زبیدہ زبیدہ ہونے لگی۔

پھر ماشااللہ چل سو چل۔ آنے والے ہر سال میں اُن کی Demand بڑھتی چلی گئی۔ غالباً 1954ء اور 1955ء میں انہوں نے H.M.V میں ایک محتاط تخمینے کے مطابق دس نغمات ریکارڈ کروائے یعنی مجموعی طور 78R.Mp میں اُن کے پانچ عدد (اُردو اور پنجابی) ریکارڈ ریلز ڈ ہوئے جسے ہم عرف عام میں غیر فلمی گراموفون ریکارڈ یا پراسوٹ ریکارڈ کہتے ہیں۔ مگر فلمی نغمات کو آئے روز سپر ہٹ ہونے اور سٹریٹ سونگ بنتے چلے جانے کے باعث ان کی تمام تر توجہ فلمی نغمہ نوائی کی طرف رہی جو ایک فطری امر تھا لہٰذا پھر مرحومہ نے کبھی ریڈیو اور گراموفون ریکارڈنگ کی طرف پلٹ کر نہ دیکھا اور جب رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئیں تو اُس کے بعد انہوں نے فلمی نغمہ نوائی سے بھی ہمیشہ کے لیے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ تحیّر زا پہلو یہ ہے کہ اُن کے شوہر فلمی دنیا سے متصل وابستہ رہے اور محترمہ بذات خود اس دنیا سے متصل الگ تھلگ رہیں، گوشہ نشین تو کیا پردہ نشین ہو گئیں اور عمر بھر انہوں نے اس پنجابی مقولے کو وفادار بشرط استواری نبھایا کہ

جیہڑا چھڈیا گھراں اویداں لینا کی ایہہ ناں

اُن کی خوش نصیبی کا ایک اور پہلو جو بہت قابل ذکر ہے وہ یہ اُن کی نجی زندگی نہایت خوش و خرم گزری آسودگی میسر رہی اس مسرت و آسودگی سے ہویدا ہونیوالے آثار طمانیت اُن کے چہرے بشرے پر نظر آتے تھے۔ جب ایک طویل ترین عرصے کے بعد اُن کے مداحین نے انہیں ٹی۔ وی سکرین پر دیکھا تو اکثر کے منہ سے بے اختیار نکل گیا Oh So graceful صاحب اولاد ہوئیں اور اللہ نے اولاد کو اپنے والدین کی خدمت کی سعادت بھی خوب عطا کی۔ وما توفیق الا باللہ۔

کچھ بھی ہے میرے اندر سے میرے باطن سے (من دانم کہ من آنم) کوئی مجھے یہ متصل کہہ رہا ہے۔ کہہ رہا ہے۔ کہہ رہا ہے۔ کیا.....؟ یہ کہ زبیدہ خانم کو بالیقین کسی مستجاب الدعوات کی دعا لگی تھی۔"

Scanned with CamScanner

یقین مانیئے ایک لحاظ سے بڑی جگر دار عورت تھیں۔ سراپا ایثار وہ یوں کہ اس قدر عروج جتنے نغمات (اردو، پنجابی دونوں) گلی گلی گونج رہے ہوں اور نور جہاں جی کی موجودگی میں جن کے نغمے بار بار سٹریٹ سونگ بنتے رہے ہوں (اگرچہ اس سے نور جہاں جی کے مقام و مرتبہ کو نہ کوئی ضعف پہنچا اور نہ ہی پہنچ سکتا تھا کہ وہ تو ہند و پاک میں اپنی مثال آپ ہیں) اور یوں وہ یکدم نظروں سے اوجھل ہو جائے۔ یہ جگر داری کی ایک بہت خوبصورت مثال ہے۔

اور حیران کن پہلو یہ بھی دیکھئے کہ اُن کی اوسطاً ہر فلم کا کوئی نہ کوئی نغمہ (بعض اوقات ایک سے زیادہ بھی) سپر ہٹ ہوا فلم خواہ باکس آفس پر ناکام رہی ہو یا کامیاب، یا اوسط درجے کی مگر اُن کے مقدر کہ وہ ہر حال میں اپنا آپ منوا جاتی رہی تھیں۔ اپنے مزاج اور اپنے Vocol Chord کے برعکس انہوں نے بعض مزاحیہ نغمات (دوگانے وغیرہ بھی) گائے بہر حال وہ بھی اُن کے فنی زندگی کا ایک حصہ ہے۔

1955ء تا 1959ء اُن کی تقریباً ہر فلم کا ایک نغمہ ضرور سپر ہٹ ہوا۔ سدا بہار کی چوٹی پر اپنے ہم مرتبہ و ہم مقام نغمات کا ہم جلیس رہا۔ گلی گلی ان کے نغمات اس عہد میں گونجنے لگے بلکہ یوں کہئے آج بھی اُن کا نغمات وہ عہد گونج رہا ہے۔ اپنے ہونے اپنی تازگی کا احساس دلاتا رہتا ہے۔

نور جہاں جی کے بعد ایک محتاط اندازے کے مطابق اُن کے نغمات گلی گلی گونجتے رہے کہ جنہیں Street Songs کہا جاتا ہے بلکہ اگر مؤرخ انصاف سے کام لے گا تو اس نتیجے پر پہنچے گا کہ اُن چند سالوں میں اُن کے پنجابی نغمات کی تعداد مقبولیت کے لحاظ سے نور جہاں جی کے نغمات سے بھی زیادہ بنتی ہے۔ زبیدہ خانم کی ایک خوش بختی یہ بھی تھی کہ عین اُن سالوں میں نور جہاں Play Back نہیں دیا کرتی تھیں صرف اپنی محدود فلموں میں اُن کے اپنے نغمات خود اُن پر ہی پکچرائز ہوتے تھے۔ اور یوں زبیدہ خانم کو من جانب اللہ متنوع ہیروئن پر پکچرائز ہونے کا موقع ملتا رہا یوں کہئے کہ مقدر نے ہر جگہ سینہ تان کر اور خم ٹھونک کر زبیدہ خانم کا ساتھ دیا اور سچ ہی تو ہے کہ اللہ مہربان تے کل مہربان۔

کئی پنجابی نغمات پے در پے سپر ہٹ ہونے کے چند سالوں اُن کے کئی اردو نغمات نے بھی دھومیں مچانی شروع کر دیں۔ اگرچہ ''فلم انوکھی'' کے ایک خوبصورت اور انوکھے نغمے سے قبل بھی انہوں نے کچھ اردو نغمات گائے تھے۔ مگر جب ''فلم انوکھی'' کا یہ ریکارڈ ریلز ڈ ہوا۔

گاڑی کو چلانا بابو ذرا ہلکے ہلکے

(نغمہ نگار۔ فیاض ہاشمی۔ موسیقار۔ حسن لطیف۔ ۱۹۵۶ء) تو شائقین موسیقی یکدم چونک اٹھے تھے ایسے شائقین نغمہ نوائی جنہیں معلومات اور فنی باریکیوں سے دلچسپی کم اور نغمات کے سننے سے زیادہ ہوتی ہے وہ ایک طویل عرصے تک اس نغمے کو انڈین فلمی نغمہ میں سمجھتے

Scanned with CamScanner

رہے اور زبیدہ خانم کی بجائے اسے گیتا دت ہی گردانتے رہے۔

بہر حال مذکورہ نغمہ بھولا بسرا میں سہی فکری وفنی لحاظ سے ترفع یعنی Sublimuity کے مقام پر فائز ہے اور جب اس نغمے کے چند برس بعد۔

آئے موسم رنگیلے سہانے

جیانہ ہی مانے

سامعین وشائقین کی سماعت تک پہنچا تو گلی گلی کوچے کوچے میں زبیدہ خانم زبیدہ خانم ہونے لگا۔

خوش بختی سے معمور ایک اور پہلو ملاحظہ فرمایئے گا کہ 1953ء تا 1959ء صرف ساڑھے چھ سال کے مختصر عرصے میں اور پھر 1956ء تا 1960ء چار سالہ مختصر عرصے میں (اوّل الذکر عرصہ پنجابی اور موخر الذکر عرصہ اردو پنجابی دونوں) ہر بڑے موسیقار نے اُن کے رس بھرے میٹھے اور موثر گلے سے ایسے ایسے شاہکار نغمات کشید کروائے کہ سبحان اللہ کہیئے۔ بحیثیت مجموعی زبیدہ خانم کا فنی کریئر بمشکل ایک دہائی پر مشتمل ہے (یعنی 1953ء تا 1962ء) ایک دہائی میں دہائیوں کی تعداد میں اسقدر سپر ہٹ۔ سدا بہار Street song چھوڑ جانا بڑی خوبصورت اور انوکھی مثال ہے۔

ان سالوں میں زبیدہ خانم نے میلہ لوٹ لیا اور بقول مبصر پنجابی زبان وادب ''بہہ بہہ جا'' (بیٹھ جا بیٹھ جا) کروادی اور عین اسی عالم میں بھریا میلہ چھوڑ دیا۔

جیوے ڈھولا اور میرا جیوے ڈھولا۔ دل غم دیاں چھلاں وچ ڈولا۔

دلا ٹھہر جایار دا نظارہ لین دے۔ ماہی موت دا سنیہا دتا گھل دے۔

لے لو جی پیمبریاں۔ میری چنی دیاں ریشمی تنداں، نی چھٹیے سجناں دیاں

بندے چاندی دے سونے دی نتھ لے کے۔ ریشماں والا چہ۔ اساں جان کے

میٹ لئی اکھ وے، سیونی مرادل دھڑکے۔ آئی آئی بہار لے کے پھلاں دے ہار

اور پھر اُردو میں:

گاڑی کو چلانا بابو۔ آج دل کو ملا دلدار۔ میرا نشانہ دیکھے زمانہ۔ آئے موسم رنگیلے سہانے۔ گھونگھٹ اُٹھالوں۔ لیلےٰ لیلےٰ لیلےٰ۔ چاند تکے چھپ چھپ کے۔ روتے ہیں چھم چھم نین۔ اے چاند اُن سے جا کر، کیا ہوا دل پہ ستم اور شاہکار نعت صلوعلیہ وآلہ یہ سب اس مذکورہ عہد کی شاہکار تخلیقات ہیں۔ وہ سب Masterpieces اس مختصر عرصے میں بہت تھوڑے تھوڑے وقفوں کے ساتھ سامنے آتے رہے کانوں میں امرت پٹکاتے رہے اور پٹکاتے ہی رہیں گے۔

Scanned with CamScanner

ایک عرصہ ہوا ایک دوست نے بتایا تھا کہ اُن کی والدہ اور اُن کی پھوپھو کے ساتھ زبیدہ خانم کی اچھی یاد اللہ تھی اور وہ اُن کے گھروں میں مجالس عزا اور محافل میلاد میں آیا کرتی تھیں۔ اُن صاحب کی اس بات کو پندرہ بیس برس بیت گئے۔ مگر چند سال قبل ہمارے ایک عزیز دوست لارنس بہادر ہیں انہوں نے ایم۔اے انگریزی کیا تھا اور موسیقی کی باقاعدہ تعلیم بھی حاصل کرتے رہے اس وقت ایک مقامی سکول میں انگریزی زبان وادب کے ساتھ موسیقی کی تعلیم بھی دے رہے ہیں۔ سُر یلے ہیں سُر شناس ہیں گا لیتے ہیں کئی ساز بھی بجا لیتے ہیں بہت پیار کرتے ہیں بڑا احترام کرتے ہیں ایک زمانے میں انٹرمیڈیٹ میں میرے شاگرد رجمند بھی رہے تھے۔ ملے تو باتوں میں باتوں میں گویا ہوئے.....!

''.....سر چند روز پہلے میں ایک دوست کے گھر گیا ہوا تھا (بخاری کر کے کچھ نام بتایا تھا یاد نہیں رہا) اُن کا تعلق بھی فلمی دنیا سے رہا ہے اُن کے والد بھی فلم انڈسٹری ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے ساتھ بھی کچھ ملاقات ہوئی پھر وہ مجھے میرے دوست اندر کمرے میں لے گئے وہاں اماں جی بیٹھی ہوئی تھیں بزرگ خاتون، انہیں سلام عرض کیا۔ اماں جی بھی بڑے پیار سے ملیں۔ وہ میرے دوست کی والدہ محترمہ تھیں۔ بہت اچھے لوگ ہیں سر وہ.....!''

''اوئے ..... میرے اس لفظ نے لارنس کی بات ارتجالاً کاٹ دی میں نے بے یقینی سے کہا'' کون ..... کیا..... کہاں.....؟ کچھ غیر ارادی توقف سے میں بے اختیار بول اُٹھا۔

''اوہ.....یار تمہیں پتہ ہے وہ اماں جی کون ہیں.....؟

''نہیں سر'' لارنس نے یہ کہتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا.....

''.....او یار.....وہ زبیدہ خانم ہیں.....جی.....'' میں تحیر آمیز مگر مسرت انگیز لہجے میں کہا۔

''اچھا.....لارنس ذرا نہ چونکا..... یہ سمجھئے کہ عرف عام میں Nolift کیونکہ اُس کی پیدائش سے کم وبیش پندرہ برس قبل زبیدہ خانم بھریا میلہ چھوڑ چکی تھیں۔.....مگر.....مگر جونہی میں نے اُن ''اماں جی'' کے گائے ہوئے اُردو پنجابی نغمات اوپر تلے دھڑا دھڑ ابتاتے تو وہ ہکا بکا رہ گیا۔ گانا شروع کر دے۔

سیونی مرا دل دھڑکے دل دھڑکے نہ اکھ پھڑکے

اور پھر اوپر تلے زبیدہ خانم کے چند سدا بہار گنگناتے گنگناتے دور کچھ تلاش کرنے لگا وہ بالیقین تصوراتی تصور پر چشم تخیل سے اپنے دوست کی والدہ محترمہ ''اماں جی'' کے نیاز حاصل کر رہا تھا۔

قصہ مختصر: اس خاکسار راقم نے ایک طویل عرصہ ریڈیو پر بطور اناؤنسر گزارا۔ زبیدہ خانم کے دو سینئر معاصرین عنایت حسین بھٹی اور منور سلطانہ کے انٹرویوز لینے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ مگر زبیدہ خانم جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تب تک انٹرویو دینے کے لیے قطعاً

Scanned with CamScanner

رضامند نہیں ہوئی تھیں۔

سو نہ انہیں دیکھ سکا نہ اُن سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا بس بس.....!

ع جو رہی سو بے خبری رہی

مگر اتنا مجھے پختہ یقین ہے کہ دہائیاں قبل ظریف کی جواناں مرگی پر سادات سٹریٹ (میکلوڈ روڈ لاہور) میں پہلی مرتبہ اُن کی گریہ کرتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی تھی اُس لمحے میری ننھی سی سماعت اُن کی آواز کے سحر کی گرفت میں آ چکی تھی۔ اُن کی مدھر پیاری، میٹھی دلنشین آواز کے بارے میں من دانم کہ من آنم کیا کہہ سکتا ہوں۔

برس ہا برس قبل کبھی کس میگزین میں ایک افسانہ پڑھا تھا جس میں افسانہ نگار نے بڑی ہی خوبصورت بات لکھی تھی۔ افسانے کی یہ سطور نیوز کا نقش فی البحر ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے گا۔

".....اور دور کہیں ریڈیو سے زبیدہ خانم کی خوبصورت آواز آ رہی تھی۔ ایسی آواز کہ جیسے خمیرہ گاؤزبان شربت بزوری کے ساتھ حلق سے نیچے اتر رہا ہو....."

سبحان اللہ۔ تعالیٰ اللہ! جس نے بھی یہ لکھا (افسانہ نگار خاتون تمہیں یا مرد بخدا نام بالکل یاد نہیں رہا) اُس کو میرا سلام میرا سیلوٹ اور انہیں زبیدہ خانم جی کے تمام مداحین کا سیلوٹ پیش کر کے اجازت چاہتا ہوں کہ..... کہ.....دور بہت دور سے ایک آواز آ رہی ہے!

ماہی موت دا سینہا دتا گھل وے ایس دنیا توں دور دِلا چل وے

☆☆☆☆

Scanned with CamScanner

باب دل

محمود احمد قاضی

سڑک کے کنارے، یہ ایک کھلا میدان سا ہوا کرتا تھا جہاں بچے آ کر گلی ڈنڈا اور کرکٹ کھیلا کرتے تھے۔ ایک دن جب محمد دین ادھر سے گزر رہا تھا تو اس کے سائیکل کی چین عین اسی مقام پر آ کر اتر گئی۔ اس نے نیچے اتر کر چین دوبارہ چڑھائی اور تب ہی اس کی نظر اس کھلی جگہ پر پڑی۔ وہ لالچ میں آ گیا۔ عین اسی لمحے اس کے ذہن میں ایک کاروبار کا خیال چمکیں مارنے لگا۔ اس نے ادھر اُدھر سے پتہ کیا۔ جو معلومات حاصل ہوئیں اس کے مطابق اس جگہ کی والی وارث بلدیہ تھی۔ وہ بلدیہ کے متعلقہ کلرک سے ملا۔ وہ وہاں مجھے تنظیمی جال کو کترتا چلا گیا اور یوں اس نے بہت کم نرخوں پر یہ جگہ ننانوے سال کے لئے لیز پر حاصل کر لی۔ اس نے سڑک کی جانب دیوار بنوائی وہاں ایک بڑا سا پھاٹک لگوایا اور سارے شہر کا کباڑ یہاں اکٹھا کر لیا۔ لوگ چھکڑوں اور گدھا گاڑیوں پر پرانا پیتل، ایلومونیم، لوہا، تانبا، پلاسٹک اور ردی کاغذ وغیرہ لے کر آتے اور یہ سارا کچھ ٹرکوں میں لاکر پگھلائی یا دیگر طرز کی پراسنگ کی غرض سے مطلوبہ جگہوں پر پہنچایا جاتا۔ چند ہی سالوں میں جب محمد دین کباڑیا، سیٹھ کباڑیا کہلانے لگا تو اس نے اسی کباڑ خانے کے پیچھواڑے والی ایک پرانی حویلی مناسب مرمت کے بعد رہائش کے لئے چن لی۔ یہ حویلی بیس فت چوڑائی والی فراخ گلی کے بالکل آغاز میں واقع تھی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی برجیاں اور منیارے تھے۔ شاید کسی نے اس رہائش گاہ کو اپنے ذوق وشوق کو تکمیل کے لئے تعمیر کروایا تھا۔ اس حویلی کے اوپر والے حصے کی پچھلی دیوار میں محمد دین نے ایک دروازہ لگوالیا تھا جہاں سے وہ آرام سے اس کباڑ خانے میں تعمیر کروائے گئے ایک چوبارے میں جو کہ اب اس کے دفتر کا کام دیتا تھا اتر آتا تھا۔ وہاں ایک لمبی میز، چند کرسیاں ایک پرانی طرز کا صوفہ اور چند ضروری رجسٹر وغیرہ کئے گئے تھے۔ وہیں ایک چھوٹی میز پر ایک بڑا سا پرانی طرح کا ٹائپ رائٹر بھی پڑا تھا۔ اس کمرے میں موجود کوئی دفتری یا کلرک ضرورت کے وقت اس ٹائپ رائٹر کو اپنے کام میں لاتا تھا۔ محمد دین زیادہ تر اپنے دفتر میں بیٹھا اخبار پڑھتا رہتا تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد اس کے سامنے کاغذ کی پرچیاں جمع ہوتی رہتی تھیں۔ یہ مال کے آنے جانے کا حساب ہوتا تھا۔ دفتر میں بیٹھ کر وہ صرف سادہ پانی پیتا تھا اور وہ بھی ڈیروں کے حساب سے پیتا تھا۔ اسے شوگر، ہائی بلڈ پریشر اور طرح طرح کی بیماریوں نے گھیر رکھا تھا۔ کاروبار خوب چمک رہا تھا اس لئے اس کی شخصیت میں بھی ایک چمک دمک آ چکی تھی وہ اب شہر بھر کا ایک معروف بزنس مین تھا۔ اس کی عزت تھی۔ ساکھ تھی۔ اس کے باوجود اس کا گھر ہمیشہ افراتفری کا نمونہ پیش کرتا تھا۔ بیوی سے اس کی بنتی نہیں تھی۔ تینوں بیٹے بھی اس سے نالاں رہتے تھے۔ وہ ہمیشہ ناکافی

Scanned with CamScanner

خرچے کا رونا روتے تھے۔ اپنی اولاد کو بھی پیسے دینے میں اس کا ہاتھ خاصا تنگ تھا۔ اسی اثنا میں اس کے لڑکے پہلے آوارہ ہوئے۔ بُری صحبتوں میں پڑے اور پھر بالکل ہی اس کے ہاتھ سے نکل گئے۔ ایک ایک کر کے تینوں اس کے گھر میں موجود تجوری میں بند کالے دھن پر ہاتھ صاف کر کے کدھر سے کدھر چلے گئے۔ وہ رہ گیا اور بڑی بی رہ گئیں۔ پر وہ بھی داغ مفارقت دے گئیں۔ وہ اور اس کی بیٹی باقی رہ گئے۔ رضیہ سلطانہ اور اس کے درمیان شروع سے محبت اور اچھے سلوک کا رشتہ موجود تھا۔ رضیہ سلطانہ بیٹی ہونے کے ناطے اس کا بہت خیال رکھتی تھی۔ وہ جب گھر آتا تو اس کی خوب خدمت کرتی۔ پھر ایک دن ایسا آیا کہ وہ سب کچھ اس کے نام کر کے اسے دعائیں دیتا ہوا ہمیشہ کے لئے اس کے پاس سے رخصت ہو گیا۔ اِدھر اُدھر بکھرے پڑے رضیہ سلطانہ کے بھائیوں نے اچانک گھر پر یلغار کر دی۔ انہوں نے گھر اور کاروبار پر چھا جانے کی کوشش کی لیکن ان نکھٹوں کی رضیہ سلطانہ جیسی پڑھی لکھی اور زیرک لڑکی کے سامنے ایک نہ چلی۔ باپ کی وصیت کے مطابق چونکہ انہیں عاق کر دیا گیا تھا اس لئے قانون نے اس کا ساتھ دیا۔ یوں وہ ساری جائیداد کی بلاشرکت غیرے مالک قرار دی گئی اور وہ بے خطر اپنے گھر کے ساتھ ساتھ اپنے کاروبار کی دیکھ بھال بھی بڑی ذہانت اور ہوشیاری سے کرتی رہی۔

ایک دن وہ اپنے دفتر میں بیٹھی روزانہ کے حساب کتاب اور لین دین میں مصروف تھی کہ نیچے شور سا ہوا۔ چند دن پہلے کلرک چونکہ بوجوہ نوکری چھوڑ کر جا چکا تھا اس لئے وہ خود سیڑھیوں سے نیچے اتر آئی اور اُس نے اپنے کارندوں کے چھوٹے سے ہجوم کی طرف نگاہ کی اور پوچھا۔

''کیا ہوا بھائی''

''یہ جی ایک بندہ ہے۔ یہیں بیرونی دیوار کے قریب ابھی ابھی اس نے قے کی ہے۔ شاید بیمار ہے۔ نقاہت سے اُس سے ہلا بھی نہیں جاتا ہم اُسے اٹھا کر اندر لے آئے ہیں۔'' رضیہ سلطانہ نے آگے ہو کر، نزدیک آ کر دیکھا۔ ایک نہایت سیاہ رنگ کا جوان العمر بندہ چارپائی پر پڑا دھیمے دھیمے سانس لے رہا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر پیچھے ہٹ گئی۔

''اسے تو ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی ضرورت ہے۔ میرا خیال ہے تم اسے گلی میں موجود ڈاکٹر قدوس کے پاس لے جاؤ۔ جلدی کرو۔''

وہ لوگ اسے اٹھا کر ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ اسے وہاں شام تک رکھا گیا۔ ڈاکٹر نے اسے گلوکوز لگا دیا۔ اس کے مطابق اس کے جسم کا پانی کم ہو گیا تھا۔ بہر حال شام تک وہ سنبھل چکا تھا۔ اسے واپس کباڑ خانے والی کھل جگہ پر لایا گیا۔ تب اس کے اور رضیہ سلطانہ کے درمیان یہ مکالمہ ہوا۔

''کون ہو بھئی تم۔ تمہارا نام''

''مجھے نہیں پتہ کہ میں کون ہوں۔ نام بھی میرے بہت سے ہیں۔ پچھلی جگہ جہاں کام کرتا تھا وہ مجھے فیقا کہتے تھے اس سے پہلے

Scanned with CamScanner

والے نذیر کہہ کر پکارتے تھے اور ماں باپ وہ پتہ نہیں مجھے کیا کہہ کر پکارتے تھے۔ ویسے یہ ماں باپ کیا ہوتے ؟''

''تم عجیب آدمی ہو۔ تم کو یہ پتہ نہیں کہ تم کون ہو۔ تمہیں اپنا نام نہیں معلوم اور ماں باپ کے بارے میں بھی تم کچھ نہیں جانتے۔ آخر تم کیا چیز ہو۔''

''پتہ نہیں۔''

''کیا پتہ نہیں کہنے کے سوا بھی تمہیں کچھ کہنا آتا ہے یا نہیں''

''پتہ نہیں''

رضیہ سلطانہ اس کے اس جواب پر زچ ہونے کی بجائے مسکرا پڑی۔

''اچھا چلو یہ تو بتا دو کہ آج کل تمہیں کس نام سے پکارا جاتا ہے۔''

''شاید مجھے جلال الدین کہہ کر پکارا جاتا ہے۔''

''جناب جلال الدین صاحب اب آپ کا ارادہ کیا ہے۔ کہاں جانا چاہیں گے آپ۔ کچھ زادراہ چاہئے یا کچھ اور طرح سے آپ کی خدمت کی جائے۔ کچھ فرمایئے تا کہ آپ کی مناسب خدمت کرنے کے بعد آپ سے اجازت لی جائے۔''

''یعنی''

''یعنی یہ کہ اب آپ صحیح ہو چکے ہیں اس لئے آپ کو یہاں سے رخصت ہو جانا چاہیے۔''

وہ خاموش رہا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

اب کی بار رضیہ سلطانہ کے چہرے پر غصے کے آثار نمودار ہوئے لیکن جلد ہی اس نے اپنے جذبات پر قابو پا کر قریب کھڑے ایک بندے سے کہا۔

''فی الحال اسے یہیں رہنے دو۔ اس کے لئے یہیں چارپائی ڈال دو اور ڈاکٹر نے جیسا کہا ہے اُس قسم کی غذا کا اس کے لئے بندوبست کر دو۔ تم لوگ جاتے وقت چوکیدار سے کہنا کہ وہ اس کا خیال رکھے۔''

یہ ہدایات دینے کے بعد وہ اوپر اپنے کمرے میں چلی گئی اور وہاں سے اپنی رہائش گاہ میں اتر گئی۔ جلال چند دن کے آرام اور علاج کے بعد بھلا چنگا ہو گیا۔ تب وہ رضیہ سلطانہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

رضیہ سلطانہ نے اس کی جانب استفہامیہ انداز میں دیکھا۔

''محترمہ میں اس لئے حاضر ہوا تھا کہ میرا آگے پیچھے کوئی ہے نہیں۔ بار بار کام کے لئے یہاں وہاں بھٹکتا پھرتا ہوں۔ بلکہ یہ بھٹکن تو شاید سدا سے ہی مرے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ کوئی راستہ، کوئی منزل مجھے اپناتی ہی نہیں۔ آپ سے التماس ہے کہ آپ مجھے یہاں

Scanned with CamScanner

کاٹھ کباڑ کے پاس میں رہنے کی اجازت دے دیں۔ میں اوپر کا کوئی کام وام کرلیا کروں گا۔ یقین مانیے، مفت کی روٹی نہیں توڑوں گا۔"

"کیا پڑھے لکھے ہو؟"

"ہاں تھوڑا سا پڑھا لکھا ضرور ہوں کہ میں نے اپنی سکولنگ ضرور ختم کرلی تھی۔ یہ شاید کسی یتیم خانے کا کوئی سکول تھا۔"

"ٹھیک ہے تم دفتر کا کام سنبھال لو۔ اگر تمہیں ٹائپ کرنا نہیں آتا تو وہ تمہیں میں سکھا دوں گی۔

"یوں کام چلنے لگے لگا۔"

"آپ کی مجھ پر بڑی مہربانی ہوگی۔ کام دے کر آپ مجھ پر بہت بڑا احسان کریں گی۔"

رضیہ سلطانہ نے اُسے چھوٹی میز کے قریب بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ویسے جلال الدین صاحب جی آپ سے اتنے سادہ نظر نہیں آتے جتنے کہ آپ خود کو دوسروں پر ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ کبھی کبھی تو آپ فلاسفر سے بھی لگتے ہیں یہ میں نے اُس دن جانا تھا جب تم نے کہا تھا۔ ویسے یہ ماں باپ کیا ہوتے ہیں۔"

جلال الدین اس کی بات سن کر ہنسا۔

"محترمہ یہ فلاسفروں والی نہیں بلکہ احمقوں جیسی بات ہوئی۔ اصل میں میں ایک اعلیٰ درجہ کا احمق ہوں۔"

"اپنے بارے میں ایسا فقرہ یا جملہ ساخت کرنے والا شخص زیرک، ذہین اور معاملہ فہم تو ہوسکتا ہے لیکن بے وقوف ہرگز نہیں ہوسکتا۔"

"یہ آپ کی عالی ظرفی ہے جو آپ میرے متعلق ایسا سوچتی ہیں۔"

"میں نے کب کہا کہ میں تمہارے بارے میں سوچتی ہوں ہاں تمہارے متعلق یہ میرا ایک خیال سا ہے۔"

"آپ کے اس قیمتی خیال کے لئے بھی آپ کا شکریہ۔"

"ارے، جلال الدین جی۔ بس اب چپ رہیے اور اپنے آپ میں رہنے کی کوشش کیجئے۔ اس بات کا ہمیشہ خیال رکھیئے گا کہ آپ اپنی حدود سے آپ کبھی تجاوز نہیں کریں گے اور مجھ سے فرینک ہونے کی کوشش کبھی نہیں فرمائیں گے۔"

جلال الدین چپ ہوگیا.....اور دفتری کاموں میں الجھ گیا۔ باقی کا سارا دن وہ اپنے کام میں جتا رہا اس نے سر اٹھا کر ادھر اُدھر دیکھنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی۔ رضیہ سلطانہ کے کچھ پوچھنے یا کہنے پر بھی نظریں نیچی کئے ہوئے جواب دیتا تھا۔ رضیہ سلطانہ اس کی اس حرکت پر زہر لب مسکراتی رہی۔

کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ایک دن رضیہ سلطانہ نے اپنے کام میں ڈوبے پا کر اس سے سوال کیا۔

"جلال الدین کیا تم نے تاریخ کا مطالعہ کیا ہے۔"؟

Scanned with CamScanner

''بہت معمولی حد تک بلکہ نہ ہونے کے برابر سمجھئے۔لیکن آپ نے مجھ سے ایسا کیوں پوچھا''۔

''میں تمہیں تاریخ کا ایک ورق پڑھوانا چاہتی ہوں۔ بلکہ اسے تمہارے سامنے دہرانا چاہتی ہوں۔ 1236ء سے 1760ء کا زمانہ تھا کہ تب سلطنت دہلی کی فرمانبردار ایک ترک خاتون رضیہ سلطانہ وہاں حکومت کرتی تھی۔ اس کا باپ التمش خاندان غلاماں کا دوسرا بادشاہ تھا۔ رضیہ سلطانہ بڑی زیرک اور خوب اچھے فہم وادراک کی مالک تھی۔ اس نے جب حبشی ملک جلال الدین یاقوت مہتم شاہی اصطبل کو امیر الامرا کا خطاب دیا۔ تو سارے ترک امرا بگڑ گئے۔ انہوں نے اس کے خلاف بغاوت کر دی۔ سنا ہے کہ رضیہ سلطانہ اُس حبشی کو دل دے بیٹھی تھی۔ اس کی سزا باغی امرا نے یاقوت حبشی کو قتل کر کے دی۔ رضیہ کو قید کر دیا گیا۔ بعد میں وہ جنگ کرتے ہوئے ماری گئی تھی۔''

''تاریخ کے اس ٹکڑے کے بیان سے میں کیا سبق حاصل کروں یا کیا سمجھوں''۔

''کچھ نہیں۔ بس یوں ہی میں نے یہ سب کہا ہے اس کے پیچھے کوئی خاص مطلب یا مقصد ہرگز پوشیدہ نہیں۔ ہاں ایک بات ضرور ہے کہ چونکہ تمہارے بیان کے مطابق تمہارا آخری نام جلال الدین قرار پاتا ہے تو پھر کیوں نہ تمہیں اُس رضیہ سلطانہ کے حوالے سے صرف یاقوت کہہ کر پکارا جائے۔''

''تو میری اس سیاہ رنگت نے مجھے اس حبشی یاقوت میں تبدیل کر دیا ہے لیکن کیا ایسے میں آپ خود وہی رضیہ سلطانہ بن پائیں گی۔''

رضیہ سلطانہ کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد بولی۔

''میں اس موقعے پر اتنا کہوں گی کہ میں نے آج سے تمہارے لیے اپنا باب دل وا کر دیا ہے۔''

جلال الدین عرف یاقوت نے پہلی بار رضیہ سلطانہ کو ایک مرد کی نظر سے دیکھا تو رضیہ سلطانہ کی نگاہیں اس کے سامنے فوراً جھک گئیں۔ جیسے کہ ہمیشہ کہا گیا ہے کہ عشق مشک کبھی چھپائے نہیں چھپتا۔ اسی طرح یہ بات بھی عیاں ہو کر رہی۔ پہلے ارد گرد چہ میگوئیاں ہوئیں پھر یہ باتیں پر لگا کر سارے شہر میں اڑنے گئیں۔ یاقوت کی پہنچ اب رضیہ کے گھر تک ہو چکی تھی۔ اب وہ آنے جانے کے لئے سڑک کی بجائے گلی کا راستہ استعمال کرنے لگا تھا۔ اُڑتے اُڑتے یہ خبر رضیہ سلطانہ کے آوارہ گرد بھائیوں کے کانوں میں بھی جا گھسی۔ وہ غصے میں آ گئے۔ دوسرے لوگ بھی اس اجنبی صورت حال کو قبول نہیں کر پا رہے تھے۔ یہ خبر Talk of the Town بنی ہوئی تھی۔ اسی اثنا میں یاقوت غائب ہو گیا۔ بہت ڈھونڈا گیا۔ تلاش کیا گیا۔ وہ نہ ملا۔ پولیس بھی اس کی گمشدگی کے معمے کو حل کرنے سے قاصر رہی۔ ایک دن رضیہ سلطانہ نے فیصلہ کیا کہ اب وہ خود یاقوت کی تلاش میں نکلے گی۔ اس کے اس اعلان کے بعد کسی نے اسے دوبارہ نہیں دیکھا۔

☆☆☆☆

Scanned with CamScanner

خبر کہیں نہیں تھی

فرخندہ شمیم

اس صبح بھی جب اس کی آنکھ کھلی تو حسب معمول کسلمند تھا.....شاید زندگی میں کوئی ایسی صبح اس کی نہیں جاگی تھی جس میں وہ ذہن اور آنکھوں میں تازگی لیے بیدار ہوا ہو.....حالانکہ زندگی گزارنے کی ضروری چیزیں اس کے پاس تھیں.....صحت، وقت، اوسط درجے کی نوکری.....کرائے کا گھر.....خوش شکل بیوی.....ایک بیٹا.....ایک ننھی پری.....مشکل البتہ اس کی تعلیم نے پیدا کر رکھی تھی۔ وہ تعلیم یافتہ نہیں، اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا اور یہی اس کی الجھن تھی.....اتنی تعلیم پا کر بھی وہ کلرک تھا.....دیکھا جائے تو کلرک ہونا کسی سبکی کی بات تو نہیں اور پھر ہر تعلیم یافتہ صدر پاکستان تو نہیں ہوتا.....لیکن سلیم اس نظریئے پر کبھی سمجھوتہ نہ کر سکا.....اس کی ضد تھی کہ ٹاٹ کے سکول سے یونیورسٹی تک کا سفر بے نفع نہیں ہونا چاہیے.....اے یہ تھیوری بھی بے معنی لگتی تھی کہ زندگی کا اصل مزہ صرف سکون میں ہے۔ وہ چڑ جاتا یہ ڈھکوسلے بے عمل لوگوں کے ہیں، جو خوابوں کی دنیا میں ہیروئن پی کر پڑے رہنا چاہتے ہیں۔ وہ زندگی میں تھرل چاہتا تھا، سکون وغیرہ کا تصور اس کے نزدیک شیخ سعدی کے دور کی باتیں تھیں، جب تھوڑے میں بھی گذارا ہو جاتا تھا۔ اب گلوبل ویلیج کا زمانہ تھا اور پوری کائنات ایک چھوٹی سی پوٹلی بن کر انٹرنیٹ میں سما گئی تھی اور Mouse کی ایک کلک سے سامنے حاضر ہو جاتی تھی.....جیسے کھل جا سم سم.....سلیم کو یہ کلک ایک فاتحانہ سرشاری دیتی تھی.....تاہم وہ خوش نہیں تھا.....معمول کے شب و روز گذارتے گذارتے اوب گیا تھا.....دفتر میں ترقی کا کوئی چانس نہیں تھا.....پورا مہینہ نارمل سی خوراک کھانا پڑتی تھی.....بیٹا اب سکول جانے کے قابل ہو رہا تھا.....بیٹی حال ہی میں پیدا ہوئی تھی.....والدین تین تلوار میں چھوٹے بھائی کے ساتھ تھے، جو زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا، لیکن ایک فیکٹری میں فورمین تھا اور ماں باپ کو سنبھال سکتا تھا۔ کبھی کبھی بیوی چھٹی کے دن چائے کی پیالی اس کے بیڈ تک لاتی اور پیار بھرے انداز میں اسے جگاتی تو وہ خوش ہونے کی بجائے جھنجھلا جاتا۔

یہ کیا فلمی سٹائل ہے یار.....بیڈ ٹی ویڈ ٹی یہ چونچلے ہم جیسوں کے لئے نہیں ہیں!!

بیوی پھر بھی مسکراتی!

اس میں کیا خرچہ آتا ہے میرا یا تمہارا.....صرف سٹائل ہی اپنایا ہے ناں.....تم سے پیسے تو نہیں مانگے!! وہ جھک کر کہتی تو اس

Scanned with CamScanner

کے سیاہ ریشمی بال سلیم کے وجود کو تیز دھوپ سے ڈھانپ دیتے..... کچھ دیر کے لئے سلیم کی زبان چپ ہو جاتی اور دل بولنے لگتا..... میز پر رکھی چائے کی پیالی ٹھنڈی ہوتی چلی جاتی..... لیکن سلیم کو بے سکون رہنے کی عادت سی ہو گئی تھی..... لگے بندھے معمول سے اس کی کبھی نہیں بنی..... اس کی شخصیت میں ایک ایسا قلعہ تھا جس میں باہر نکلنے کا راستہ مفقود تھا، وہ دفتر کے با اثر لوگوں سے یہ سوچ کر نہیں ملتا تھا کہ وہ کم تعلیم یافتہ ہو کر بھی اس کے باس ہیں، ہو سکتا ہے اپنی دولت کے گھمنڈ میں اس کے آئیڈیاز نظر انداز کر دیں جو اس کی توہین ہو گی..... وہ جونیئر سٹاف اور چھوٹے عہدوں پر کام کرنے والوں سے یہ سوچ کر بات کرنا ضروری نہ سمجھتا کہ وہ غریب اس کے نظریات کہاں سمجھ پائیں گے..... وہ تو ان پڑھ ہیں..... جھنجھلا کر سلیم بس ایک خواہش کرتا.....

کاش کوئی جھٹکا لگے..... کسی نئے پن کا احساس تو ہو..... کوئی ہلچل، کوئی افراتفری، مزا آ جائے..... اگر آسمان پر لال آندھی آئے..... شاید اس وقت سربراہوں کو احساس ہو یہ قیامت لائق لوگوں کو نظر انداز کر دینے کی وجہ سے آئی ہے..... یہ شہر کے اونچے اونچے پلازے، خطرناک زلزلے سے ہل جائیں کاش یہ سوچتے ہوئے وہ بڑا مطمئن ہوتا کہ جیسے کوئی بد دعا نہیں صرف خواہش کر رہا ہو.....

اور پھر واقعی اخباروں کی سرخیاں بدل گئیں..... قرطاس، ابیفس قرطاس احمریں بن گئے..... شہر میں آئے دن قتل و غارت سے خون خون ہونے لگا..... بوری بند لاشیں

فائرنگ..... گھروں میں گھس کر لوٹ مار

سلیم کا دماغ کسی اور سمت کام کرنے لگا

''دیکھا تم نے؟'' اس نے بیوی سے کہا..... ''یہ سب مال بنانے والوں کا انجام ہے.....

''لیکن یہ تو غریب اور نہتے مر رہے ہیں؟'' بیوی دل برداشتہ ہو کر بولی۔

''نہیں بھئی، کسی نہ کسی کے آلہ کار رہے ہیں یہ لوگ، اب انجام بھگتیں''۔

''یا اللہ خیر'' بیوی پریشانی میں دعا مانگنے لگی۔

''ویسے کچھ بھی ہو یار'' سلیم بے رحمی سے بولا۔

برسوں سے ایک جیسا موسم تھا شہر کا، بور رنگ، یکسانیت کا مارا، کچھ تبدیلی تو آئی کم از کم!!

بیوی نے خوفزدہ ہو کر اسے دیکھا..... اسے اپنا شریک حیات ابنارمل لگا۔

یہی دیکھو..... اخبار پڑھنے کو جی چاہنے لگا ہے اب..... کچھ نئی خبریں ہر روز ملتی ہیں..... پہلے تو صرف صدر، وزیر اعظم، وزیر اعلیٰ، گورنر، بیوروکریٹس، سماجی کارکن، ان کی سرگرمیاں..... بلا بلا بلا..... اس نے آخری الفاظ انگریزی میں کہے تھے، لیکن بیوی کو لگا وہ بلاؤں کی بات کر رہا ہے.....

Scanned with CamScanner

اوراب.....اب کیا نیا ہے؟ بیوی کو تجسس ہوا۔

اب؟؟ سلیم کی آنکھیں چمکنے لگیں

دیکھو شہر کے الگ الگ حصوں میں ہلچل.....کہیں سیاسی، کہیں سماجی، کہیں لاٹھی چل گئی.....کہیں چاقو.....کہیں پرانی دشمنی پر فائرنگ.....کہیں روٹی نہ ملنے پر خودکشی.....سلیم جانے کیا کیا ہذیانی بک رہا تھا.....اس کی بیوی گھبرا گئی.....ہائے اللہ.....یہ سب تو خطرناک باتیں ہیں۔

لیکن کم از کم نئی تو ہیں..... پرانی گھسی پٹی زندگی اور معمول کی بوریت میں کچھ تو نیا ہونے لگا ہے.....شاید ایسی ہی کوئی لال آندھی ہماری زندگی کو بدل کر نئی کر دے.....کوئی خوشحالی میں ہاتھ آجائے..... ہاں؟؟ اکس نے بیوی کی آنکھوں میں جھانکا.....وہ وحشت زدہ سی شوہر کو دیکھنے لگی.....اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

لال آندھی سے ہمیں کیسے خوشحالی مل سکتی ہے؟؟ سوچ سوچ کر اس کا دماغ گھومنے لگا..... یہ سلیم کیسی باتیں کرنے لگے ہیں؟؟

شہر میں روز بروز حالات بدتر ہو رہے تھے، صوبے کی وفاق کے ساتھ بالکل نہیں بنتی تھی.....چنانچہ وطن دشمنوں کی چاندی ہوگئی.....شہر پر وحشت کی جگہ دہشت چھا گئی.....خطرناک بم.....خودکش حملہ.....دہشت گرد کا بریدہ سر.....حکومتوں اور دانشوروں کی مذمت.....اور ہر بار دفتروں اور گلیوں میں احتجاج.....سلیم کا یہ پسندیدہ موضوع تھا.....اسے مروجہ نظام سے سخت اختلاف تھا.....دفتر میں اس کی تقریریں شروع ہوگئیں.....لوگ حیران ہوئے.....وہ تو کبھی بولتا ہی نہیں تھا.....اتنا اچھا اور مدلل مقرر ہے وہ؟ یہ تو اب پتہ چلا تھا.....واہ واہ.....شاباش.....بہت خوب.....تعریفوں کے دونگڑے اتنے برسے کہ سلیم زندہ ہوگیا.....اسے جینے کا مصرف مل گیا تھا.....اعلیٰ تعلیم متاثر کن ثابت ہونے لگی.....اب اس کا بیشتر وقت دفتر میں گذرتا تھا..... جتنے لوگ حکومتی نظام کے خلاف تھا..... اس کے ہم خیال بن گئے.....وہ تقریر کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتا..... پھر ایک دن اچانک وہ دفتر سے غائب ہوگیا.....کہاں گیا؟؟؟ کہیں اٹھوالیا گیا؟؟ سمندر پار بھیج دیا گیا یا.....؟

نہیں نہیں اس کی بیوی چلائی.....'وہ کسی بوری بند.....نہیں.....ہر طرف تلاش شروع ہوئی.....دفتر کے لوگوں نے پولیس.....مقامی انتظامیہ.....سماجی کارکن.....میڈیا.....سب کو اطلاع دی.....سلیم کا کہیں پتہ نہیں چلا.....بدنصیب بیوی آنسوؤں کی جھڑی میں اخبار پر جھکی سلیم کی خبر ڈھونڈتی رہی!!

☆.....☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

نرالا

نمود مسلم

نایاب کی پیدائش کے وقت سے اس کے گھر میں انوکھی اور نرالی باتیں رونما ہونے لگی تھیں۔ اوّل یہ اپنے دادے کی اولاد کے گیارہ بچوں کی اولاد میں سے پہلا لڑکا تھا۔ نام لڑکیوں کی طرح کا رکھا گیا۔ باپ جو ایک عرصے سے بے روزگار تھا سرکاری نوکری پر لگ گیا۔ پھوپھی جس کی شادی پورے گھرانے کے لئے مشکل بنی ہوئی تھی وہ بھی طے پا گئی۔ اسے اتنا پیار ملا کہ محلے والے اور اقربا کا کہنا تھا کہ بچے کو تو رونا ہی نہیں آتا۔ اگر کبھی رویا بھی تھا تو اب اسے بھول گیا ہے۔ اسے بچپن سے ہی چلنے کی عادت نا تھی کہیں جاتا تو کسی چچا ماموں دادا یا پھوپھی کی گود میں ہی ہوتا۔ خوب ناز اٹھوا تا نخرے کرتا گھر والے چائے سے روٹی کھاتے مگر جناب کو خصوصی طور پر انڈا دیا جاتا۔ دادا جو ریٹائرمنٹ کے دنوں میں بھی دکان پر ترکھانوں والا کام کر کے دن گزار رہا تھا اس کا کاروبار وسیع ہونے لگا۔ دور کے لوگ دادے کے ہنر کی داد دینے لگے۔ پھوپھی کی ایسی شاندار شادی ہوئی محلے والے شک میں پڑ گئے کہ کہیں انہیں کوئی دفینہ مل گیا ہے۔ دونوں چچا بھی برسر روزگار ہو گئے۔ اب تو جہاں اپنی سائیکل نہیں تھی وہاں موٹر سائیکل کھڑے ہوتے تھے اور نایاب کبھی کسی اور کبھی کسی چچا کے ساتھ موٹر سائیکل کی ٹینکی پر بیٹھا ہواؤں میں اڑ رہا ہوتا تھا۔ کسی کو روتا دیکھ کر اسے تعجب ہوتا کہ کیسے روتے ہیں۔

لاڈ نے نایاب کو بگاڑ دیا تھا مگر اس کا لاڈ اس وقت کم ہوا جب اس کے بھائی نے جنم لیا۔ سب کی نظریں دوسرے کی جانب مڑ چکیں تھیں۔ یہ سوچتا تھا مگر اس کو رونا نہیں آتا تھا کہ ان سب کو کیا ہو گیا ہے۔ باپ جو پہلے صرف ناراضگی میں ماں کو مارتا تھا اب کبھی کبھی اس پر بھی ہاتھ صاف کر دیا کرتا تھا۔ اگر کبھی آنسو آنکھوں میں تیرنے ہی لگتے تو چھت کے ڈراونے کمرے میں چلا جاتا جہاں پھوپھی اور چچا اسے نومولود بچے کی طرح اپنی گود میں سمیٹ لیتے اور دادی کے پاس لا کر اس کو کہانی سناتے تجھ جیسا ایک بادشاہ کا بیٹا تھا..... جو سب سے بڑا تھا..... اگر اس کو چوٹ بھی لگ جاتی تو وہ روتا نہیں تھا..... کیوں بھلا..... وہ تو اس بادشاہ کا وارث تھا..... وہ پوچھتا..... وارث نہیں روتے..... مگر میرا نام تو وارث نہیں..... وہ بولتے..... نام سے وارث نہیں بلکہ اپنے رتبے سے ہوتے ہیں..... وہ مسکرا دیتا۔

کبھی کوئی شرارت کرتا تو ماں بھی مارتی اور وارث کی بجائے نئے مہمان کا اسے خیال زیادہ تھا۔ اسے کچھ سمجھ آنے لگی۔ تو ایک

Scanned with CamScanner

بھائی اور ہو گیا وہ اکلوتے سے دو اور اب تین کے ہندسے سے جانا جانے لگا تو اپنی ہی دنیا میں رہنے لگا۔ مگر اسے کبھی رونا نہیں آیا تھا۔ وہی چھت کے کمرے میں جا کر چھپ جاتا کبھی چچا کبھی پھوپھی اور کبھی ماں ڈھونڈ نکالتی۔ مگر اسے رونے نہ دیتے اور اسے کہتے ہمارے خاندان نے صدیوں حکمرانی کی ہے ہم رونے کے لئے نہیں اپنی اپنی روایات کے لئے جیتے ہیں۔

لاڈلے چچا کی شادی میں منجھلا بھائی شہبالا بنا تو حیران رہ گیا مگر جب ماموں کی شادی میں سب سے چھوٹا شہبالا کے روپ میں سامنے آیا تو اسے رونے کو دل کیا۔ مگر رو نہ سکا اس کا چھوٹا چچا اسے پیر مکی کے میلے میں لے گیا۔ خوب کھایا پیا۔ مٹی کے کھلونے لئے جب رات کو آیا تو رونا بھول چکا تھا۔ تھوڑا اکھڑا اکھڑا رہنے لگتا تو اس کا سب سے چھوٹا چچا پھر اسے سائیکل پر دودھ پلانے اور کبھی کبھی گڈی ڈور دلا کر اس کے موڈ کو ٹھیک کر دیتا تھا۔

تایا کے بارے میں اس کی رائے جب سے ہوش سنبھالا تھا کچھ ٹھیک نہ تھی سوائے اس کی بیٹی جو اسے اچھی لگتی تھی اسی کی خاطر کبھی کبھار چلا جاتا تھا۔ باقی لڑکے اس کے چھوٹے بھائی سے بھی چھوٹے جھجھو اس کی پیدائش سے قبل بیٹی کی پیدائش کے بعد نجانے کیوں علیحدہ ہو گیا تھا۔ اس برا لگتا تھا کہ تایا اگر ساتھ نہیں رہتا تو ملنے تو آیا کرے جیسے دوسروں کے عزیز آتے ہیں۔ مگر دادا کے غصے کے بارے میں اسے معلوم ہوا جب اسی کا چچا ڈنڈوں پایوں اور ادھوائن سے پٹ رہا تھا۔ دادی کی زبان کا احساس تب ہوا جب اس کی ماں کو میکے صرف اس بات پر بھیج دیا صبح اٹھ کر نہانے سے پہلے چائے کیوں نہیں دی۔ باپ کے بارے میں اس کی رائے پہلے ہی پختہ تھی کہ وہ انتہائی غصیلہ ہونے کے ساتھ ساتھ لاپروا بھی ہے کہیں ڈنڈے سے مارتے ہوئے وہ معذور بھی ہو گیا تو اسے دکھ نہ ہو گا۔ ان حالات میں اسے کبھی رونے کو جی چاہتا تو چھت پر جاتا کہ ڈراؤنے کمرے میں جا کر روئے تو اسے ساتھ والوں کی لڑکی نظر آ جاتی۔ اسے رونا بھول جاتا۔

خاندان کی پہلی نرینہ اولاد کو اس کا چچا سکول لے کر گیا مگر اس کے بعد کسی کو پتا نہیں تھا وہ کس سکول اور کس جماعت کا طالبعلم ہے پہلے سب سے چھوٹا چچا دادے سے لڑ کر گیا تو اس کی لاش گھر آئی لوگ کہتے ہیں راوی میں نہاتے ہوئے ڈوب گیا تھا۔ اسے اب تو رونا تھا مگر اہل محلہ اسے ٹیوشن کے بہانے گلشن پارک لے گئے۔ آٹھویں میں پہنچا تو چھوٹی پھوپھی کا رشتہ ہوا مگر انہوں نے لاکھ بہانے کر کے رشتہ بھی توڑا اور اتنا بدنام کیا کہ پھوپھی گھر میں باندیوں کی طرح رہنے لگی۔ اسے اس کا احساس تھا ہی نہیں صرف دادی کو

ابھی بھی اس کے مزید تین چچا تھے۔ مگر نایاب خود کو ایک شہزادہ ہی سمجھتا رہا۔ اپنے بچپن کے دنوں کے حوالے سے اسے یہ گمان تھا، جواب اسے سے ناراض ہیں بات نہیں کرتے وہ اچانک اسے اپنی گود میں لیں گے ہم تو مذاق کر رہے تھے۔ چلو تمہیں اس بسنت پر خاص بھارتی ڈور لیکر دیتے ہیں۔ تمہیں سکول جانے کے سائیکل کی ضرورت ہو گی چلو نئی لے کر دیں۔ یہ انڈا تمہارے لئے بنایا ہے۔ مگر اس طرح کی بات تو درکنار اب چچا کی اولاد ہونے کے بعد کوئی اسے دیکھتا بھی نہ تھا۔ پڑھنے سے بھاگنے لگا۔ فلمیں زندگی پر اثر انداز ایسی ہوئیں کہ ہر شے کو فلمی انداز سے دیکھتا اور گانوں فلمی مکالموں نے اسے رونے روکے رکھا اور خاندان کا بڑا لڑکا اور وارث ہونے کا خیال

Scanned with CamScanner

آنے پر ذرا اتر آ کر چلنے لگتا۔

چچا ایک دن دفتر گیا تو گھر نہ آیا۔ چچا کا دوست اسے اسپتال لے گیا جہاں کوئی بھی نا تھا جو اس کے چچا کی خون آلود لاش وصول کرتا کیونکہ دادا، دادی، کنواری پھوپھی، باپ اور ماں سب شادی پر گاؤں میں تھے اور لاہور شہر میں پرچوں کی وجہ سے چچا، چچی اور اس کے دو بچوں کے ساتھ گھر میں اکیلا تھا۔ یہ اس کی نویں جماعت کا پرچہ جس میں کامیابی کے بعد بورڈ کے امتحانات میں اسے امتیازی نمبر لے کر کالج میں پڑھنا تھا اور ڈگری لے کر باپ کے ہی دفتر میں افسر لگنا تھا۔ اچانک افتاد نے اسے غمگین کرنے کے بجائے اسے مزید مصروف کر دیا۔ پولیس اس کا بیان چاہتی تھی کہ کسی کا نام لے تا کہ اس کے خلاف پرچہ درج کر کے وہ بھی فارغ ہوں۔ مگر وہ گنگارام اسپتال میں اپنے چچا کی لاش مانگ رہا تھا۔ جیب میں صرف بارہ آنے تھے۔ خیراتی ادارے کی ایمبولینس رجسٹریشن کے لئے دو روپے مانگ رہے تھے۔ کہیں چچا کے دفتر کے لوگ آئے انہوں نا جانے کیسے اطلاع گھر والوں کو دی، لاش گھر لائے اور پولیس کو لکھ کے بھی دے دیا کہ حادثے میں متوفی کا قصور تھا۔ گھر والوں نے روپیٹ کر چچا کو دفنایا مگر پتا نہ چلا کس گاڑی کی ٹکر سے اس کا چچا مرا۔ وہ رونے کی بجائے سفید نئی گاڑی کئی دن ڈھونڈتا رہا۔ کیونکہ سب نے اسے کہا تھا وہ ہی خاندان کا وارث ہے۔

دادی ایک رات سوئی پھر نہ جاگی یہ نایاب کا آسرا تھی جو کبھی کبھی اسے چھپ کر روپیہ دو روپیہ دے دیتی تھی اب کی مرتبہ اس کے آنسو چہرے پر تھے۔ میٹرک پھنسا غمگین تھا۔ کہ اس کا دادا بھی دل بند ہو جانے سے قبرستان چلا گیا۔ جس کا اسے زیادہ رنج نہ تھا مگر صرف دوستوں عزیزوں کو دکھانے کے لئے گلے مل کر سسکتا تھا اس کو سچ مچ رونا نہیں آ رہا تھا اور خاندان کا بڑا لڑکا تھا اس لئے سب کو ذمہ داری سے جنازے پر لاتا منہ دکھاتا پانی کا پوچھتا تھا۔ اس نے میٹرک کا امتحان اگلے سال دینے کا فیصلہ کیا تو چھوٹا بھائی گھر سے بھاگ گیا۔ ادھر پھوپھی کا خاوند منشیات فروش کرتا پکڑا گیا۔ اس کا باپ تو گھر کی فکر سے دور تھا وہ کیا کرتا۔ سوائے گالیاں بکنے کے۔ یہی نایاب تھا جو اپنے نئے بنے شناختی کارڈ پر اور ایک ہم جماعت کے بھائی کے ہمراہ تھانے کچہری اور کوٹ لکھ پت جیل دیکھ رہا تھا۔ اس قدر مصروف تھا کہ رونا کیا کھانا پینا بھول گیا۔ گھر میں اب اپنے باپ کے بعد وارث وہی تھا بڑا وہی تھا۔ پیسہ نام کی چیز اس کے پاس نہیں تھی اور پھوپھی بھی اکلوتا رکشہ بیچ کر اپنی لڑکی کی شادی کی فکر میں تھی۔ یہ بھی تھک گیا۔

کنواری پھوپھی کی شادی دور کے ایک پچاس سالہ عزیز سے ہو گئی تو ایک دن پھوپھی ملنے آئی تو اس نے اسے پڑھنے کی تلقین کی۔ کہ تو اس خاندان کا وارث ہے۔ مگر اسے میٹرک کرنا مشکل ہو گیا۔ آوارہ گردی معمول بنی اور پھر تعلیم مکمل چھوٹ گئی۔ ایک دکان پر سیلز مین لگا تو اس نے اپنے خاندان کے بارے میں پھر سے سوچنا شروع کیا بھائی ملا تو وہ ایک مزار کے مجاور کا خادم بن چکا تھا۔ سب سے چھوٹا چپ چاپ باپ کی مار اور گھر کی نحوست کی باتیں سن کر ماموں کے ہاں چلا گیا۔ اس کی جیب میں پیسے آنے لگے تو اس کی توجہ صنف مخالف کی جانب گئی۔ محلے کی دو تین لڑکیاں اور شہر کے ہر علاقے میں اسی چکروں میں پھرنے لگا۔ تایا بھی اسے اچھا لگنے لگا وہ بھی صرف بیٹی کی

Scanned with CamScanner

وجہ سے۔باپ ریٹائر ہوا تو ملنے والا پیسہ خود سنبھال کر بیٹھ گیا۔اس نے دکان کھولنے کا کہا تو باپ نے اس مار کر گھر سے نکال دیا۔اس نے دن کی سیلز مینی کے ساتھ رات کو ایک کپڑے کی فیکٹری میں ملازمت کر لی جس کی وجہ باپ سے مسلسل دوری اور فیکٹری کی غریب گھرانوں کی لڑکیاں تھیں۔اب اسے بچپن یاد نہیں آتا تھا۔چھٹی یا ہڑتال والے دن کبھی اسے اپنا پیارا چھوٹا چچا، پھوپھی، کبھی دادی یا بڑا چچا یاد آتا تو غمگین ہو کر چھت پر چلا جاتا رونے کی کوشش کرتا تو اسے پتنگیں اڑانے والے باہر نکال لیتے ان کی بوکاٹا کی آوازیں سب باتیں محو کر دیتیں یہ بھی ڈور اور "تاوا" پکڑا کر ہوا کے رُخ کی جانب مڑ جاتا اور رات کا اندھیرا غالب آتا تو چھت سے اترتا۔چچا پھوپھیوں اور دادی کا پیار ماں کی باتیں اس کے دماغ میں گھر کر گئیں تھیں وہ بادشاہ کا پیارا سا کہانی والا بڑا بیٹا تھا جس نے اپنے خاندان کو اور سلطنت کو دوام دینا تھا۔اسے روایتی بسنت کا تیوہار بھی دوسروں کے گھروں میں کرنے کی عادت ہو گئی تھی۔گھر صرف ماں کے لئے جاتا اور گھر کی در و دیوار پیار سے دیکھتا۔کچھ پیسے ماں کے ہاتھ پر رکھ کر نکل جاتا، پھر ایسا اپنی زندگی میں مگن ہوا کہ اس نے رونے کی بجائے حوصلہ کرنا سیکھ لیا اور پھر اسے روتے لوگوں سے کراہت ہونے لگی۔

ایک روز دکان پر جانے سے پہلے کپڑے بدلنے آیا تو باپ نے اسے ایسے پیار کیا کہ وہ ایک دم پانچ سال کا ہو گیا پچیس سالہ جوان باپ کی گود میں سر دے کر اس کی قمیض سے کھیلنے لگا کہ جیسے پہلی بار دیکھی ہے۔اسے پتا ہی نہ چلا کہ اس کے باپ نے اس کی شادی تایا کی بیٹی سے طے کر دی ہے۔جو اس سے تین سال بڑی ہے اسے بچپن سے وہ اچھی لگتی تھی دوسرا ایک عرصے کے بعد کسی نے اسے پیار کیا تھا اس نے فوراً حامی بھر لی۔جو پیسے اس کے پاس تھے باپ کو یہ جانتے ہوئے دے دیئے کہ اس کے باپ کی ریٹائرمنٹ کے پیسے داد اکی دکان اور چھوٹے چچا کے سامان کے پیسے کے علاوہ دادا کی دکان کا کرایہ بھی باپ ہی وصول کرتا ہے۔مگر بہت خوش تھا جیسے آج پھر وہ چچا کے ساتھ سائیکل پر بیٹھا ہے۔فیکٹری میں اوور ٹائم لگانے سے انکار کر کے صبح پانچ بجے گھر پہنچ گیا۔آتے ہی اپنے کمرے کی جانب گیا جو کبھی اس کے چھوٹے چچا کا کمرہ تھا اور بڑے ہی اہتمام سے چادر ٹھیک کر کے چٹائی پر سو گیا۔دس بجے ماں کے ہاتھ کا بنا ناشتہ کھایا جس میں پیازوں والا انڈا بھی تھا اور ساڑھے گیارہ بجے دکان پر چلا گیا۔جہاں اس کا باپ آ گیا اور شادی کے انتظامات کے بارے باتیں کرنے لگا۔مالک بھلا آدمی تھا اس نے اسے دوپہر سے اگلے ایک ہفتے کی چھٹی دی اور شادی کی چھٹی ہنسی خوشی قبول کر لی۔فیکٹری کہلوا بھیجا وہ بیمار ہے ایک ہفتہ نہیں آئے گا۔

ایک عرصے کے بعد نایاب کے گھر میں شادیانے بجے تو اسے بچپن یاد آ گیا چچا پھوپھیوں کی شادی پر کی جانے والی ساری شرارتیں اسے مسکرانے پر مجبور کر رہیں تھی مگر جو قبرستان پڑے تھے ان کی اچھی باتیں ہی تھیں جو اسے یاد تھیں۔وہ گھر کو پھر سے گھر بنانے اور اپنے مرحومین کا وارث ہونے کے زعم میں صرف ان کی تعریفیں کر رہا تھا۔دلہن گھر آئی اس کی دنیا ہی بدل گئی فیکٹری چھوڑ دی۔اس کی بجائے فیکٹری کا مال شام میں ٹرکوں کے ذریعے دوسرے شہر بھیجنے لگا جو اس نے اپنے فیکٹری کے منیجر سے ٹھیکہ لیا تھا۔اس کی بیوی پیاری تھی

Scanned with CamScanner

جوان اور اپنی تھی اسے زندگی کا مزا آنے لگا۔

ایک روز گھر پہنچا تو ماں باپ منہ بسورے بیٹھے تھے اور بیوی غائب تھی اسے سمجھ نہ آیا پہلے کس کا پوچھے؟ پتا چلا اس کی بیوی ماں باپ سے لڑ کر گئی اور بہت بدتمیزی کی تھی اس نے۔ تایا کے گھر پہنچا تو پتا چلا کہ وہ ناراض ہو کر نہیں آئی ماں کے ساتھ آئی ہے بھائی کا رشتہ دیکھنے جانا تھا۔ یہ سن کر پریشان ہو گیا۔ وہ تو کچھ اور سن کر آیا تھا رات تایا کے گھر رہا صبح وہیں سے دکان پر چلا گیا۔ شام کو مال بلٹی کروانے سے پہلے بیوی کو نہاری کھلاتا گھر لایا۔ پھر ایک دن جب وہ رات گئے گھر پہنچا تو اس کا باپ اس کی بیوی کو مار رہا تھا۔ ماں گالیاں بک رہی تھی۔ پہلے تو اسے سمجھ نہ آئی کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ مگر باپ کے منہ سے نکلنے والا ایک جملہ کہ ''وہ کون تھا'' اس کے ہاتھوں کو روک نہ سکا۔ جب بیوی پٹ گئی تو محلے والوں کو بولی جو اپنی چھتوں اور گلی میں تماشہ سن اور دیکھ رہے تھے۔ ''میرے باپ کو کوئی اطلاع کر دے کہ اپنی بیٹی لاش لے جا'' تایا اپنے رشتے کے سالے اور اس کے بیٹوں کو لیکر پہنچا تو محلے والے بیچ میں آ گئے۔ بیوی چلی گئی۔ مہینہ یونہی گزرا پھر کچھ دور کے رشتے داروں نے معاملہ ٹھیک کرا دایا صلح ہوئی بیوی گھر آ گئی۔ شک کا بیج اسے کھایا جا رہا تھا۔ خوبصورت اور ابتر حال بیوی اسے ایسے لگی جیسے وہ فیکٹری کے مال کو انتہائی دھیان سے لے کر چل رہا ہے تا کہ دوسرے شہر کے لئے بلٹی کر دے اور اصل مالک تک پہنچ جائے۔ تمام لکھت پڑھت اس کے نام ہونے کے باوجود اس کی اپنی بیوی کسی کا مال لگنے لگی جیسے کسی بھی اس کی بلٹی اسی کے ہی ہاتھ ہو جائے گی۔ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ بیوی روتی تھی کہ پوچھ مجھ سے وہ کون تھا؟ یہ اعتبار کا بہانہ گھڑ کر اس کی بانہوں میں سمو جاتا۔

یہ ڈراؤنے کمرے میں جا کر رونے کی کوشش کرتا تھا۔ مگر صرف دل غمگین لگتا آنسو نہ نکلتے پھر ہنستا باہر آ جاتا۔ ایک روز پھر گھر پہنچا تو بیوی نہیں تھی۔ پوچھنے پر پتا چلا اپنے بھائی کے ساتھ گئی ہے روز کی طرح آج اسے دیر ہو گئی اس نے پتا لگوایا تایا کے محلے میں پہلے کہیں رہنے والی ایک سہیلی جو چوبرجی رہتی ہے اس کے گھر گئی ہے۔ یہ چھوٹے سالے کو لے کر وہاں پہنچا تو شک کا بیج جڑیں پکڑنے لگا۔ ایک شخص نے اسے بیٹھک میں بیٹھایا پھر اس کی بیوی آئی جو اسے آج بیمار اور کمزور لگ رہی تھی اور اس کے ساتھ چل دی اور ایک فرمائش کی کہ آج وہ پیدل نہیں چل سکتی رکشہ یا تانگہ دیکھ لے اس نے بھائی کے بارے میں استفسار کیا تو لاپروائی میں بولی وہ چلا گیا تھا۔ اس نے اس کی سہیلی کا پوچھا تو اس نے کہا ہاں مانو بچپن کی سہیلی ہے یہ اس کا خاوند تھا جو تمہیں ملا۔ اب زیادہ بات نہ کرو وہ میری طبیعت خراب۔ رات بھر وہ سوتی بیوی کو دیکھتا رہا۔ اس کے آنسو بہہ رہے تھے اسے احساس نہیں ہوا کہ تکیہ بھیگ گیا ہے۔ آنسو نکلنے پر وہ حیران ہوا پھر آنسوؤں کو پونچھ کر سو گیا صبح دیر سے اٹھا تو بیوی تکلیف سے کراہ رہی تھی بالکل رات کی طرح جس کا اسے اب احساس ہوا۔ اس نے پوچھنے پر کہا یہ زنانہ بیماری ہے تم جاؤ کام پر۔ دکان آج بند تھی مگر وہ پھر بھی گھر سے نکل گیا اور اس کی سہیلی مانو کے گھر پہنچا۔ دروازہ کھڑکایا وہی شخص نکلا اس نے سلام کیا تو نایاب کو پہچانتے ہوئے وہ گھر کے اندر لے آیا۔ گھر میں داخل ہوا تو دیکھا منظر کچھ اور ہی تھا۔ وہ جوان ایک نوعمر لڑکا اور ایک بزرگ موم بتیاں لفافوں میں ڈال رہے تھے۔ وہ شخص بنا کسی تمہید کے تلخ لہجے میں بولا تم اپنی بیوی سے پیار کرو مجھے اپنی دوست

Scanned with CamScanner

سے پیار کرنے دو بیچ میں آئے تو اچھا نہیں ہوگا۔اب پھر اس کے آنسو نکلنے لگے۔وہ شخص پھر بولا تمہاری بیوی تم سے بڑی ہے وہ تمہیں بچہ سمجھتی۔اس لئے میں بھی تمہیں کچھ نہیں کہتا۔نایاب اسے سننے کی بجائے اپنے آنسوؤں کو ہاتھ لگا لگا کر دیکھ رہا تھا۔اس شخص نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا تمہاری وجہ سے میرا بچہ تمہارے تایا نے مروادیا تھا کہ غیر خاندان کا خون ہمارے ہاں نہیں آتا اور کل میں نے اس کا بدلہ لے لیا ہے۔تم بیچ میں نہ آتے تو آج وہ خوش ہوتی۔بلکنے لگا آنسو نکل رہے تھے۔اپنی اولا کے بارے میں سنا تو اس کو مارنے کے لئے غیرت کے مارے اٹھا کہ اچانک اس کا سالا گھر میں داخل ہوگیا پھر ملازموں کے ساتھ نے اسے مل کر اسے مارنے لگے۔مگر آنسو بہاتا پیٹتا رہا۔اور پھر دور بیوی کو مطمئن اور درد سے کراہتے دیکھ کر چیخ مار کر رونے لگا۔سالہ ایک دم پیچھے ہٹا اور بولا۔نرالا آدمی ہے کبھی جنازے پر رویا نہیں اب ڈرامے کر رہا ہے۔باہر پھینک دو اسے خود کو خاندان کا وارث سمجھتا ہے اب اسے کون سمجھائے بڑے بیٹے کی اولاد ہی وارث ہوتی ہے۔جاہل کہیں کا.....

☆☆☆☆

Scanned with CamScanner

حسن کاظمی

غزل

جو مہک رات کی رانی کی ہے
غالباً تیری جوانی کی ہے

تم جسے اپنی صدا کہتے ہو
لہر وہ میری کہانی کی ہے

تجربہ تم کو کہاں ہجرت کا
تم نے تو نقل مکانی کی ہے

ہم نے ہر بات کہی ہے لکھ کر
تم نے ہر بات زبانی کہی ہے

شعر تو سب ہی حسن کہتے ہیں
بات تو صرف روانی کی ہے

☆.....☆☆☆.....☆

محمد ممتاز راشد

غزل

اُس کو جیتیں گے ہم خود کو ہاریں گے
ہیرے جیسا دل بھی اس پر واریں گے

اب مہمان بنیں گے یارِ خاص کے ہم
جائیں گے، بیٹھیں گے، پاؤں پسارین گے

ایک عجیب خرابی ہے کچھ لوگوں میں
بات بات پر طنز کے نیزے ماریں گے

کاش سُدھارنے والے عہد کریں خود سے
سب سے پہلے اپنا آپ سدھاریں گے

اُس کو بچانا ہے بے سمت بلاؤں سے
خون بہا کر اُس کی نذر اُتاریں گے

اُتنا ہی ہر سمت اُجالا پھیلے گا
جتنا تخلیقات کو آپ نکھاریں گے

جو بھی ان کو دیکھے، دیکھتا رہ جائے
شہپاروں کے ایسے نقش ابھاریں گے

اب تک ایک وقار سے گذری ہے اپنی
باقی عمر بھی شان کے ساتھ گذاریں گے

عزم کیا ہے سر اَفرازی کا ہم نے
محنت سے اپنی تقدیر سنواریں گے

اب بھی صدائیں دیتے ہیں تجھ کو راشد
مرتے وقت بھی ترا نام پکاریں گے

Scanned with CamScanner

فرخ راجا

غزل

بن گیا ہوں شوریدہ شام کی ہوا میں بھی
دے رہا ہوں گلیوں میں آج تک صدا میں بھی

یہ جہانِ معنی ہے یا جہانِ بے مایہ
کچھ ملا نہیں اُس کو کچھ نہ پاسکا میں بھی

تیز دھوپ میں اُجلے نقش ہی کچھ ایسے ہیں
جُھک گیا ہے میرا سر ہوں برہنہ پا میں بھی

رات چند لوگوں کی مُٹھیوں میں جگنو تھے
واں پہ اپنے حصے کا لے گیا دیا میں بھی

خواب کی تمنا میں گفتگو ستاروں سے
کاش میں بھی سو سکتا کاش جاگتا میں بھی

آنسوؤں کی رم جھم میں ٹمٹما رہا ہے وہ
غم کی تیز بارش میں بھیگتا ہُوا میں بھی

بانٹے نقدِ بدنامی دست شوق نے فرخ
لینے والے لاکھوں تھے بیچ میں کھڑا میں بھی

☆.....☆☆☆.....☆

محمد علی ظاہر

غزل

اک ستارہ جو مری آنکھ سے ڈھلنے لگا ہے
اِس کا مطلب ہے کوئی خواب پگھلنے لگا ہے

اور کیا ہو گی بھلا شوقِ مسافت کی دلیل
تیرا بیمار تو اب نیند میں چلنے لگا ہے

یہ جو معدوم ہوا جاتا ہوں میں روز بروز
ایک آئینہ مرا عکس نگلنے لگا ہے

اُس کے سینے میں کوئی آگ سلگنے لگی ہے
میری آنکھوں سے کوئی چشمہ اُبلنے لگا ہے

میری شہرت تو ہے از خود تری ممنونِ کرم
یار! تو یونہی مرے نام سے جلنے لگا ہے

☆.....☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

ڈاکٹر نبیل احمد نبیل

غزل

تیری آواز ایسی ہی آواز
دل میں اُترے کوئی کوئی آواز
کس قدر درد سے بھری آواز
آج بھی ہے وہی تری آواز
اُس تلک بھی کبھی تو پہنچے گی
جان پائے گا وہ مری آواز
تیرے جانے کا سانحہ تھا عجب
پھر نہ پہنچی کہیں مری آواز
کس قدر شور تھا قیامت کا
کون سُنتا کہیں کوئی آواز
پھر سے حیرانیوں میں گُم ہیں جہاں
اُبھر آئی دبی دبی آواز
اِس پہ خوش ہے یہ کب سے دل میرا
پھر سُنوں گا وہ ایک ہی آواز
غم کی شدّت بھی کچھ نہیں بدلی
میرا دُکھ ہے وہی، وہی آواز
تیر نکلا ہُوا کمان سے ہے
نہیں پھر جاکے لوٹتی آواز
یہ رہے گی میاں سدا محفوظ
یہ ہے کوئل سی کوکتی آواز

کہیں کُنجِ قفس میں سُنتے ہیں
کس قدر وہ لطیف سی آواز
وہ کہاں کھوگئی نہیں معلوم
ہائے وہ اک گداز سی آواز
کون آفت سی آن پہنچی ہے
پھر سے ہے یہ تھکی تھکی آواز
باغِ جاں میں وہ ہم ہماتی ہُوئی
آرہی ہے کھِلی کھِلی آواز
اک زمانہ ہُوا سُنے جس کو
ہاں وہی تو جُدا ہوئی آواز
ایسی آواز ہے کہیں آواز
رس میں ڈوبی ہُوئی تری آواز
آج ٹُوٹی ہے پھر قیامت کیا
آج پھر سے ہے دُکھ بھری آواز
اپنی آواز سے کِسے ہے مفر
جیسی بھی ہو بُری بھلی آواز
یہ تمنّا بھی اب نہیں ہے میاں
کاش دیتا ہمیں کوئی آواز
ہم اُسے بھول بھی نہیں پائے
سُن رہے ہیں سُنی سُنی آواز
جو کبھی زیست کی علامت تھی
مر رہی ہے کہیں وہی آواز

Scanned with CamScanner

دھیان سے وہ کبھی نہیں اتری
سہمی سہمی سی تھی کوئی آواز

مے کدے سے یہ کون نکلا ہے
بہکی بہکی ہے پھر وہی آواز

کون دھرتا ہے کان موسم پر
کون سنتا ہے دُور کی آواز

جیسے صحرا کی خاک اڑتی ہے
ایسی صورت، اُڑی اُڑی آواز

پھاڑ ڈالے نہ اپنے کانوں کو
اِس قدر گونجتی ہوئی آواز

دل کے باہر بھی سرسراہٹ ہے
دل کے اندر بھی شور کی آواز

دشت میں چھا گیا ہے سناٹا
مار ڈالے نہ خوف کی آواز

تیر نکلا کمان سے تو گیا
جا کے لوٹی نہیں کبھی آواز

دل میں جب درد بڑھنے لگتا ہے
بولتی ہے ڈھکی چھپی آواز

کھُل گیا ضبطِ غم کا آخر راز
آرہی ہے رُندی ہوئی آواز

گا رہے ہو خوشی کا گیت مگر
سوز میں ہے گُندھی گُندھی آواز

کب تلک سسکیاں رواں رکھیں!
آرہی ہے رُکی رُکی آواز

دل میں جب درد بڑھنے لگتا ہے
بولتی ہے دبی دبی آواز

درد جب حد سے بڑھنے لگتا ہے
بولتی ہے ڈھکی چھپی آواز

ایسی آواز بھی کہیں نہ سنی
سُر میں ڈوبی ہوئی تری آواز

پھر سے نکلے گا ڈوبتا سورج
پھر سے ابھرے گی ڈوبتی آواز

آتے جاتے میں روز سنتا ہوں
کوئی آواز، سائے سی آواز

اک دھماکا ہوا ہے اور آئی
لرزی لرزی ہوئی کوئی آواز

کرب فرقت سے آشنا ہے وہی
جس نے دیکھی ہے روٹھتی آواز

اس میں اب بھی ہے کوملتا
تیری آواز رس بھری آواز

جس کو دیکھو اسی گلے سے نبیل
آ رہی ہے رُندی رُندی آواز

☆.....☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

ڈاکٹر نبیل احمد نبیل

غزل

ہمیں خبر تھی جو احباب کرنے والے تھے
وفا کی رسم کو نایاب کرنے والے تھے
یہ ایک کام بھی احباب کرنے والے تھے
یہ حیات کو گرداب کرنے والے تھے
تمھیں ستارہ کیا تھا کہ رات جلنے لگی
ابھی تو ہم تمھیں مہتاب کرنے والے تھے
بھلا ہُوا کہ محبت بھی ہوگئی معدوم
ہم اپنے آپ اسے خواب کرنے والے تھے
گئی بہار، شکوں ہے، وگرنہ اہلِ جنوں
رگِ حیات کو مضراب کرنے والے تھے
تمام عمر سلیقہ نہ آیا جینے کا
تری طرح ادب آداب کرنے والے تھے
وہ جن کے ہاتھ کٹے روٹیوں کی چوری پر
وہی تو دشت کو شاداب کرنے والے تھے
حنائی ہاتھ سے وہ، پھول پھینکنے والے
خموش جھیل کو گرداب کرنے والے تھے
بجھا بجھا سا دِیا لَو بڑھا بڑھا کے ملے
جمالِ یار کو بے تاب کرنے والے تھے
وہ کون تھے جو بناتے تھے موج کو کشتی
تھے کون ناؤ جو غرقاب کرنے والے تھے
تمام عمر وہی خواب ہم نے دیکھے ہیں
جو خواب آنکھ کو بے خواب کرنے والے تھے
تمام عمر لبوں پر سوال بن کے رہے
جو لفظ شہد کو زہراب کرنے والے تھے
ہمارے عہد کے شاعر تمھارے آنچل کو
مثیلِ شہپرِ سُرخاب کرنے والے تھے
تھے کون زم زمِ شیریں نکالنے والے
تھے کون؟ جو اِسے زہراب کرنے والے تھے
ہمارے عہد نے ان کو دیا ہے قیس کا نام
محبتوں کو جو کم یاب کرنے والے تھے
لگا کے آگ گھٹاؤں میں اِس زمیں کے غنیم
فلک کی جھیل کو بے آب کرنے والے تھے
اُنھیں سمجھتا رہا میں سدا محافظِ جاں
جو میری موت کے اسباب کرنے والے تھے
بدن کا باغ گلوں سے مہک اٹھا جیسے
کچھ ایسا حال مرے خواب کرنے والے تھے
تمھارے حسن کے منظر تھے مثلِ قوسِ قزح
دل و نگاہ کو بے تاب کرنے والے تھے
تمام عمر وہی خواب ہم نے دیکھے ہیں
جو خواب آنکھ کو بے آب کرنے والے تھے
چمکنے والا تھا سارا ہی آسماں جس سے
ہم اُس ستارے کو نایاب کرنے والے تھے
مرا شمار بھی ہوتا تھا اُن چراغوں میں
جمالِ یار جو بے تاب کرنے والے تھے
تری جدائی نے ایسے مجھے تباہ کیا
تباہ جس طرح سیلاب کرنے والے تھے
تمام عمر کے تیرے نیاز مند نبیلؔ
جبینِ شوق کو محراب کرنے والے تھے
کہاں گئے جو محبت کی کھیتیوں کو نبیلؔ
جگر کے خُون سے سیراب کرنے والے تھے

☆.....☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

ڈاکٹر نبیل احمد نبیلؔ

غزل

بچھڑنے والا اگر لوٹ کر نہیں آتا
سفر حیات کا کٹتا نظر نہیں آتا

ترے خیال کو جب اوڑھ کر نکلتا ہوں
سفر ہو جتنا بھی دشوار، ڈر نہیں آتا

سسک رہا ہے دریچے میں ڈوبتا سورج
کہ اب تو صبح کا بھولا بھی گھر نہیں آتا

تمام شہر ہی زخموں سے چُور چُور ہوا
مسیحا بنتا ہے، لیکن ادھر نہیں آتا

وفا، جفا کی نہیں ہے یہاں پہ بات کوئی
کوئی بھی زخم بھرے گا، نظر نہیں آتا

ہمیں بھی اِذن سفر ہے اُسی طرف کو جہاں
کہیں بھی راہ میں کوئی شجر نہیں آتا

طلوع ہوتا ہے خورشید اس طرف بھی مگر
وہ لے کے پہلو میں اپنے سحر نہیں آتا

محبتوں کا یہ رشتہ نہ ٹوٹنے پائے
وہ کام کر جو کسی سے بھی کر نہیں آتا

اُسے تو وقت نے تبدیل کر دیا ہے نبیلؔ
وہ جیسا پہلے تھا، ویسا نظر نہیں آتا

☆.....☆☆☆.....☆

ڈاکٹر نبیل احمد نبیل

غزل

کہیں پہ اشک، کہیں چشم تر بناتا ہوں
میں اپنی موج میں رہ کر بھنور بناتا ہوں

پھر اس کی لو سے نکلتا ہے اک نیا سورج
تمھارا چہرہ دِیے پر اگر بناتا ہوں

یہی حوالہ مرا معتبر حوالہ ہے
میں سارے نام ترے نام پر بناتا ہوں

مرے لیے مری پہچان جو بھی بن جائے
میں شاعری میں اک ایسی ڈگر بناتا ہوں

میں اپنے ڈھب سے بناتا ہوں تیری دنیا کو
سو بار بار اسے توڑ کر بناتا ہوں

پھر اس کے بعد ہوا بھی بجھا سکے نہ چراغ
میں تیرگی سے کچھ ایسی سحر بناتا ہوں

میں چاہتا ہوں مرے ساتھ وہ کرے باتیں
کسی طرح تری تصویر اگر بناتا ہوں

بگاڑ لیتا ہے میرے تمام خال و خد
وہ آئنہ میں جسے توڑ کر بناتا ہوں

مہکنے لگتا ہے آنگن عجیب خوشبو سے
فصیل پر تری تصویر اگر بناتا ہوں

مجھے وہ کرتا ہے مسمار صبح و شام نبیلؔ
خود اپنے آپ کو بارِ دگر بناتا ہوں

تلاشتا ہوں نئے موڑ روز و شب میں نبیلؔ
ترے نگر میں نئی رہ گزر بناتا ہوں

رہِ حیات کے تپتے ہوئے سفر میں نبیلؔ
میں اپنے جسم کو اکثر شجر بناتا ہوں

☆.....☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

آیاتِ ادب۔ جعفر بلوچ

ڈاکٹر اختر علی

جعفر بلوچ ایک قادرالکلام شاعر، ادیب اور استاد کی حیثیت سے معروف تھے۔ ''آیات ادب'' سے پہلے ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آ چکی تھیں۔ ''مطلعین''، ''اقبالیات اسد ملتانی'' اور اقلیم۔ شاعر ہونے کے ساتھ ''اقبالیات اسد ملتانی'' نے ان کی شہرت میں مزید اضافہ کیا۔ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن بھی چھپ چکا ہے۔

''آیات ادب'' ان کی چوتھی کتاب تھی۔ اس کتاب کے حوالہ سے وہ ایک محقق کی حیثیت سے اُبھرے تھے۔ کتاب کا عنوان پرکشش ہے اور حقیقت پر مبنی تھی۔ عربی میں آیات کا مطلب نشانیاں ہے۔ کتاب میں جو شاعر و ادیب شامل ہیں دراصل وہ بھی آئندہ نسل کے لئے آثار اور نشانیاں ہیں۔ اس وقت ان کا تعلق ایک خاص خطہ یعنی لیہ و مظفر گڑھ سے تھا لیکن جعفر بلوچ کی کوششوں نے ان کی شہرت کو کم از کم پاکستان کی سطح تک وسعت دی۔ فاضل مصنف کی کوشش سے نہ صرف کتاب میں شامل شاعروں اور ادیبوں کو زندگی ملی بلکہ اُردو ادب کی تاریخ میں بھی ایک اہم اضافہ ہوا۔

جعفر بلوچ ایک مخلص انسان تھے۔ وہ روایتوں اور قدروں کے پاسبان اور اسلاف کی عظمت کے امین تھے۔ زیرِ نظر کتاب میں انہوں نے اسلاف کی قدر و منزلت اور عظمت کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی فی زمانہ نشر و اشاعت کمرشل ہو کر رہ گئی ہے۔ ہمارے ملک میں ذہین، عالم، فاضل، ادیب اور شاعروں کی تعداد کافی ہے۔ جو اپنی تحریریں کاغذ پر منتقل کرتے رہتے ہیں۔ لیکن زمانہ انھیں چھپنے کی مہلت نہیں دیتا۔ یوں ہمارا اکثر و بیشتر علمی و ادبی خزانہ ضائع ہو جاتا ہے اگر وہ تحریریں شائع ہو جائیں تو ان سے قومی ذہن مستفید اور لکھنے والا زندۂ جاوید ہو سکتا ہے۔ ایسا نہ ہونے کی وجہ سے ادیب یا لکھنے والا علاقائی حدود میں مقید ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے نقوش مدہم ہوتے جاتے ہیں اور آخر ان کا نام لیوا بھی کوئی نہیں ہوتا۔ جعفر بلوچ ایک ایسا مردِ میداں تھا جس نے ایسے لکھنے والوں کو زندہ رکھنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ یہ کتاب اس کا بین ثبوت ہے۔

جعفر بلوچ نے کتاب کا انتساب جناب ڈاکٹر غلام محمد بلوچ (مرحوم) کے نام کیا ہے ڈاکٹر صاحب موصوف ایک مونس اور ہمدرد ڈاکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک علمی، ادبی شغف رکھنے والی شخصیت بھی تھے مگر کتنے لوگ ہیں جو ان کے گوناں گوں اوصاف اور

Scanned with CamScanner

حیثیتوں سے باخبر ہیں۔اسی کا اندازہ جعفر بلوچ کے ''سرمتن'' سے ہوتا ہے۔جس میں انہوں نے اُن کی شخصیت کا اجمالی خاکہ کھینچا ہے اوران سے اپنی نسبت کا انکشاف کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں۔

''اس فقیر کو ڈاکٹر بلوچ مرحوم کا داماد ہونے کا شرف حال ہے اور انتساب کے لئے یہی نسبت بھی کافی وجہ جواز تھی لیکن انتساب کی وجہ اس ذاتی نسبت کے علاوہ یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر صاحب مسیحا نفس اور کریم الطبع ڈاکٹر ہونے کے علاوہ دین وسرزمین پاک کے سچے جذبۂ عشق سے سرشار تھے اور علم وادب سے انھیں گہری وابستگی تھی۔''

ایسے بہت سے گہرہائے یک دانہ کتاب کی زینت بن گئے ہیں اس کا سہرا جعفر بلوچ کے سر ہے۔

کتاب میں دو قسم کی شخصیات کو جگہ دی گئی ہے۔پہلی قسم میں وہ حضرات وبزرگان شامل ہیں جو علمی وادبی حلقوں میں، متعارف ہیں۔ان میں حضرت زکریا ملتانیؒ، حضرت عبدالعزیز پرہیارویؒ، راجہ محمد عبداللہ نیاز، سید سرمد ترمذی، کشفی ملتانی، شارق انبالوی، نسیم لیہ، خیالی امروہوی، غافل کرنالی، فتح محمد کلاچی، فرمان پٹیالوی، نواب جلال میرزاخانی، حکیم سید عبدالمجید راجی، قیصر عباس قیصر رضوی، گفتار خیالی، نسیم عادل، ڈاکٹر مہر عبدالحق، جعفر بلوچ اور قائم نقوی وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔باقی تمام شخصیات تقریباً علمی وادبی حلقوں میں غیر معروف ہیں۔ان میں سے اکثریت کو فاضل مصنف نے کتاب میں ''گہر ریزے'' کے تحت جگہ دی ہے۔

شیخ الاسلام بہاؤالدین حضرت زکریاؒ ملتانی ایک عالم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک صوفی اور روحانی پیشوا بھی تھے، کتاب ان کے علم وفضل، کمالات، رشد وہدایت اور روحانی مجالس کے انعقاد، ذوق خدائی، علمی خدمات، فنون لطیفہ سے گہری دلچسپی اور ادبی وشعری ذوق کا مظہر ہے۔بحیثیت صوفی اور عالم حضرت صاحب موصوف کا ایک اہم نام تھا مگر بحیثیت ادیب وشاعر وہ اس کتاب کے حوالہ سے متعارف ہوئے۔

ایسا ہی ایک اور نام حضرت عبدالعزیز پرہیارویؒ کا ہے جنھوں نے تھوڑی عمر پائی مگر اس عرصہ حیات میں بحیثیت صوفی، مفسر، محدث، طبیب، فلسفی، ریاضی دان اور ماہر طبیعات ولسانیات ممتاز ہوئے، شاعر ونثار کی حیثیت سے بھی مشہور ہوئے۔زیر نظر کتاب ان کی ان حیثیت کی ترجمان ہے۔ان کی چند تصانیف پر جی۔ڈبکیولائٹز، علامہ اقبال اور سید مناظر احسن گیلانی کی آراء بھی پیش کی گئی ہیں۔

یہ کتاب مخصوص علاقہ کی علمی وادبی شخصیات کا مفصل تذکرہ ہے فاضل مصنف نے اس میں مختلف شخصیتوں کے خاندان، تاریخ پیدائش ووفات، تعلیم، مشاغل مختلف حیثیت، علمی، ادبی، شعری خدمات اخلاق وعادات، کمالات، اثرات اور نمونہ کلام کی حتیٰ الوسع نشاندہی کی ہے، بلاشبہ یہ ایک عمدہ تحقیقی کاوش ہے۔جعفر بلوچ کشفی ملتانی، کے مختصر مگر جامع سوانح حیات لکھتے ہوئے تحقیقی نقوش کا جادو یوں جگاتے ہیں: ''کشفی صاحب دائرۂ دین پناہ میں 15 جون 1900ء کو پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم یہیں حاصل کی۔ورنیکلر مڈل کوٹ ادو سے کیا۔لیہ سے 1918ء میں جونیئر سپیشل کا امتحان پاس کیا۔ڈیرہ غازی خاں سے 1919ء میں سینئر سپیشل اور 1921ء میں میٹرک

Scanned with CamScanner

کے امتحانات پاس کئے۔ 1922ء میں متاہلانہ زندگی کا آغاز ہوا۔ ملتان سے 1924ء میں نارمل اور 1928ء میں ایس وی کے کورس کئے۔ نارمل میں جناب کیفی جامپوری اور آپ نے نارمل اسکول ملتان کے ادبی جریدہ ''نخلستان'' کی ادارتی معاونت کی۔ فقیر غلام حیدران دنوں ''نخلستان'' کے مدیر تھے۔

کشفی صاحب نے 1921ء میں بطور مدرس ملازمت کا آغاز کیا اور سلیمانیہ اسکول انارکلی لاہور میں تیس روپے ماہانہ پر اُستاد مقرر ہوئے۔ دوران ملازمت میں ڈیرہ غازی خان، ملتان، ریواڑی، راولپنڈی، رہتک، سیالکوٹ وغیرہ میں آپ کے تبادلے ہوتے رہے۔ 1944ء میں آپ نے قبل از وقت پینشن لے کر سلسلۂ ملازمت کو خیر باد کہہ دیا اور مظفر گڑھ میں سیاسی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے۔ ملک قادر بخش جھکڑ کے مقابلہ میں الیکشن لڑا اور شکست جیتی۔ 1948ء میں آپ ملتان سے دستی پریس لے آئے اور طباعت کا کام شروع کیا بعد میں یہ کاروبار ان کے اکلوتے بیٹے جناب جاوید وصفی نے سنبھال لیا اور اسے خوب ترقی دی۔ 1950ء میں مظفر گڑھ سے ایک ہفتہ روزہ اخبار ''بشارت'' جاری کیا جو ان کی وفات کے بعد 1976ء میں بند ہو گیا..... ''بشارت'' سے قبل بھی کشفی صاحب متعدد جرائد کی مدیرانہ سرپرستی فرما چکے تھے ان جرائد میں پیغام ترقی مظفر گڑھ، ملتان پنج، اور ''باغ و بہار'' خصوصاً قابل ذکر ہیں۔''

اکثر مقامات پر جہاں مصنف نے ادیبوں اور شاعروں کا فارسی نمونہ کلام پیش کیا ہے وہاں قارئین کی سہولت کے لئے ان کا ترجمہ اور مفہوم بھی لکھ دیا گیا ہے۔ کتاب میں فتح محمد کلاچی، راجہ محمد عبداللہ نیاز، عطاء اللہ ناوک، نواب جلال میرزا خانی، کشفی ملتانی، پروانہ بجنوری، غفور ستاری، شہید ابن علی، نسیم لیہ، خیال امروہوی، اور غافل کرنالی کا تذکرہ نسبتاً زیادہ پیش کیا گیا ہے۔

اس کتاب کے حوالہ سے جعفر بلوچ کی ایک اور حیثیت ظاہر ہوتی ہے وہ مترجم کی حیثیت ہے۔ انہوں نے تھامس گرے کے چند انگریزی اشعار کا فی البدیہہ ترجمہ کیا ہے جو ترجمہ نہیں بلکہ ان کی تخلیق معلوم ہوتا ہے۔

کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ جعفر بلوچ کے انداز بیان میں سادگی، دلکشی، معنی آفرینی اور اختصار ہے۔ انہوں نے راجہ محمد عبداللہ نیاز کے حالات قلمبند کرتے ہوئے ان کی شاعرانہ حیثیت کا تعین اس انداز سے کیا ہے۔

''نیاز صاحب کے کلام میں ایک دو غزلیں بھی شامل ہیں۔ لیکن بنیادی طور پر وہ غزل کے نہیں بلکہ نظم کے شاعر تھے۔ اور عشق خیر الانام، صلی اللہ علیہ وسلم ان کی فکر کا مرکزی نقطہ تھا۔ نیاز صاحب کی نظموں کے موضوعات تاریخی، معاشرتی اور سیاسی میں اور ان کا دینی زاویۂ نگاہ ان سب موضوعات کو محیط ہے۔ ان کے کلام میں طنز و مزاح کا عنصر بھی بہت نمایاں ہے۔''

کتاب میں شامل شخصیات کے مختصر حالات، خدمات اور کارناموں پر یہ پہلی کتاب ہے۔ اس لحاظ سے ان شخصیات پر تحقیقی کام کا آغاز کرنے والوں کے لئے بلاشبہ یہ حوالہ کی کتاب ہوگی۔

☆☆☆☆

Scanned with CamScanner

تاریخ ناروے.....ہماری تاریخ کا پرتو

زاہد مسعود

''تاریخ ناروے'' کو جب میں نے پڑھ لیا تو اس حوالے سے ذہن میں لاتعداد سوالات اٹھنے لگے شائد اس لیے کہ ''تاریخ ناروے'' کے مصنف پاکستانی ہیں یا شائد اس لیے کہ پاکستانیوں کو تو اب تک خود اپنی درست تاریخ کا پتہ نہیں چلا حالانکہ اس کے لیے ڈاکٹر مبارک احمد نے در در کی ٹھوکریں کھائیں اور اپنی زندگی غارت کی۔

میں نے جب ''تاریخ ناروے'' کا مطالعہ شروع کیا تو مجھے یوں لگا کہ یہ تو ہماری اپنی ہی تاریخ ہے وہی سرمایہ داری نظام، وہی کھیتی باڑی کے لیے افرادی قوت کا استحصال جنگجوؤں کا دوسروں کی جان مال پر بے جا تصرف اور بے یار و مددگار عام لوگوں کو غلام بنانے کی ایک سوا یک تراکیب ''ہادل ہورفارگرنے'' کی وفات کے بعد اس کے بیٹوں میں ہونے والی تخت نشتی کی کشمکش کے ذکر سے شاہجان اور اس کی اولاد، دارشکوہ، اورنگ زیب وغیرہ یاد آنے لگے اور پھر کس طرح ''ایرک'' نے نیک طینت بادشاہ اورنگ زیب کی طرح اپنے تمام بھائیوں کو قتل کرایا اور مذہبی قوتوں کو ساتھ ملا کر اپنی بادشاہت مسلم کی۔ ناروے میں بھی حکمرانی کے مصاحب (Lemsmem) عوام الناس قسم کے مزارعوں سے جمع پونجیاں ہتھیا کر بادشاہوں کی نذر کرتے اور اعلیٰ عہدے پاتے۔ وہ لوٹ کھسوٹ کے نظام کو مستحکم کرنے کے لیے بادشاہوں کے فرامین پر عمل درآمد کرنا ''ثواب دارین'' سمجھتے تھے۔ عوام سے جرمانے وصول کرنے والوں کا اصل فریضہ ہمارے والیان ریاست کی ہر طرح انسان خون چوس کر بادشاہ کا خزانہ بھرنا ہی تھا۔

ناروے کی تاریخ کے بیشتر موضوعات ہمارے تاریخی موضوعات جیسے ہی ہیں مثلاً طبقے، مذہبی طاقت، عظمت گذشتہ، ہمسایہ ملکوں کی دراندازیاں حتیٰ کہ ''بانسا'' جیسی بھارتی کمپنی جو ہماری ایسٹ انڈیا کمپنی کا ہی دوسرا یا پہلا رُخ تھا۔

بہرحال اس دردناک تاریخ کے مطالعے کے بعد میری دلچسپی صرف اس موڑ تک باقی رہ گئی جہاں سے ناروے ایک مہذب، ترقی یافتہ اور فلاحی ریاست بنا، یہ وہ منزل ہے جس کی آرزو میں ہمارے پاکستانیوں کی تین نسلیں دار فانی سے کوچ کر چکی ہیں اور باقی آنکھوں میں خواب سجائے بیٹھی ہیں۔

Scanned with CamScanner

یہ موڑ تب آیا جب 1814ء میں ناروے کا آئین منظور ہوا (ہمارے ہاں یہ کام کسی تک 1971ء میں ہوا) 1812ء میں ناروے کا پرچم ڈیزائن ہوا، 1814ء میں ہی ناروے والوں نے اپنی معیشت کو چاندی سے منسلک کر کے کمال اعتماد سے خود کفالت کا مظاہرہ کیا اور مالی بحران پر قابو پایا 1850ء میں صنعتی انقلاب کا نعرہ لگائے بغیر ناروے نے اپنے نام مال کی بنیاد پر صنعتوں کا جال بچھایا اور 1870ء میں ریلوے اور دیگر مواصلاتی ذرائع کو ترقی دے کر منڈی اور معیشت سے براہ راست جوڑ دیا۔

یہاں آ کر ہم نے ترقی معکوس کا سفر کیا اور آج تک جا رہے ہیں۔ ہمارا ایک قدم آگے بڑھتا رہے تو دس قدم پیچھے جاتے ہیں۔ اس کی واحد وجہ ہے کہ ہم نے عام لوگوں کو حکمرانی میں شامل کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی اور آمریت کے خلاف کامیاب جدوجہد کا ثمر چند خاندانوں اور مخصوص طبقوں تک پہنچ سکا جسے جمہوریت کا نام دے کر بادشاہ لوگ بادشاہت کے مزے لوٹ رہے ہیں اور عوام کا خون چوس کر ٹوپیوں پر رنگا رنگ کلغیاں سجا کر معزز بنے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ حکمرانی کو اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں اور لوگوں کی اپنے حقوق میں اٹھنے والی آواز کو غیر جمہوری رویہ قرار دے کر مسترد کر دیتے ہیں۔

ناروے میں بھی تحریک نسواں چلی، پرہیز گاری کی تحریک چلی، شراب نوشی کے خلاف تحریک چلی۔ مگر جذباتیت اور مذہبی منافقت سے ہٹ کر سراسر قومی مفاد میں ان مسائل کا حل نکالا گیا جس کے سوسائٹی پر مثبت اثرات مرتب ہوئے یوں لگتا ہے کہ ترقی یافتہ ملکوں کے لوگوں نے اپنے المیوں، محرومیوں اور صدموں سے جو سبق سیکھا وہ اب تک نو آبادیاتی غلاموں اور غیر ترقی یافتہ ملکوں کے لوگوں نے نہیں سیکھا۔

تاریخ ناروے کی ایک خوبصورت حقیقت یہ ہے کہ پارلیمان کو صحیح معنوں میں بالادستی حاصل ہے یہی وجہ ہے کہ قانون سب کے لیے برابر ہے اور فرد کو اس کے تمام بنیادی حقوق حاصل ہیں۔ پورا قانونی نظام ان حقوق کا محافظ ہے۔ جبکہ ہم ابھی تک ناروے سے کم از کم 200 سال پیچھے ہیں حالانکہ کہا جاتا ہے کہ ہمارے ہاں وسائل کی نہیں کیا منصوبہ بندی کی کمی ہے؟ ناروے کی تاریخ میرے لیے ذاتی طور پر محرومی کا ایک روز نامچہ ہے مگر ایک شاعر کی حیثیت سے ناامید مرنا میری قسمت میں نہیں سو میں چاہوں گا کہ خالد محمود کی طرح کا مؤرخ یہاں بھی جنم لے جو اسٹبلشمنٹ کا مؤرخ نہ ہو!

ناروے کے جاگیرداروں اور بیوروکریٹس نے آپس کی طویل محاذ آرائی کے بعد بالآخر مقامی حکومت کی حوصلہ افزائی کی اور یہ اہتمام کیا کہ عوام کو حکمرانی میں موثر حصہ دیا جائے تاکہ وہ اپنے مسلسل حل کرنے میں معاون ثابت ہوں۔ ہمارے ہاں یہ موقع جنرل مشرف نے پیدا کیا جب اس کے ایک لائق جنرل نقوی آزاد ضلعی حکومتوں کا ڈھانچہ بنایا۔ مگر کچھ ہی عرصہ بعد خود جنرل مشرف ہی اس سے مکر گئے اور انھوں نے غیر مقبول سیاستدانوں کو گود میں لے کر اپنا دور اقتدار طویل تر کرنے کی لوری الاپنی شروع کر دی۔ بیوروکریٹ تو اس نظام کے ویسے ہی خلاف تھے کہ ان کی حاکمیت پر زد پڑی تھی نیز جاگیردار ایم این اے اور ایم پی اے بھی اس عوامی شراکت والے

Scanned with CamScanner

نظام کے مخالف تھے سواس کی بساط بھی جمہوریت کے نام پر لپیٹ دی گئی۔اس ناکامی سے ایک اور نقصان ہوا کہ بیوروکریٹس اور جاگیردار (جواب آجر و تاجر بھی ہے) طبقے میں اتحاد اور یگانگت میں اضافہ ہوا جس نے آگے چل کر جمہوریت کے نام پر ''این، آر، او'' جیسے غیر عوامی تصورات کو پذیرائی عطا کی۔ان دونوں طبقوں کو جس موقر اور موثر قوت کی پشت پناہی درکار ہے ناروے کے بیوروکریٹس اور جاگیرداروں کو ان کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔

خالد محمود کی ''تاریخ ناروے'' ایک شاندار کاوش ہے کہ ایک غیر ملکی زبان میں ایک ایسے ملک کی تاریخ رقم کی ہے جو اس کا ملک نہ تھا مگر اب لگتا ہے خالد محمود کے لیے ناروے کی شہریت یقیناً ایک بہتر چوائس ہوگی۔مجھے اندازہ ہے کہ یہ تاریخ رقم کرتے وقت مصنف نے کئی سطحوں پر محنت کی ہے اور بحیثیت پاکستانی اس عذاب سے گزرا ہوگا جس عذاب میں سے میں اور دیگر پاکستانی (جو اس تاریخ کو پڑھیں گے) گزریں گے۔کاش یہ تاریخ میرے ملک کے جاگیردار، مقتدر اور بیوروکریٹس ضرور پڑھیں تاکہ انھیں احساس ہو کہ اُن کے مفادات کا تحفظ اس ملک کی بقا کے ساتھ منسلک ہے اور اُن کا ذاتی تحفظ بھی اس ملک کے عوام کی فلاح و بہبود کا عمل مکمل ہونے کے بعد اور یقینی ہوگا۔

خالد محمود کا تعلق ضلع جہلم کے گاؤں متہ لوسر سے ہے جو شیر شاہ سوری کے بنائے ہوئے قلعہ رہتاس کے قریب واقع ہے۔یہ گاؤں یقیناً چک الماس کے قریب ہوگا جہاں کے ایک گھر کی کھڑکی سے میں نے بچپن کی ایک صبح قلعہ رہتاس کی پہلی اور آخری جھلک دیکھی تھی۔اس سارے علاقے کے بیشتر لوگ معاشی ہجرت کر کے ناروے آئے اور اپنی محنت اور جفاکشی سے ناروے کو کسی حد تک ''کھاروے'' میں بدل دیا مگر ناروے کی تاریخ کی تحقیق ایک انوکھا اور مشکل کام تھا جسے صرف خالد محمود نے ہی کیا ہے لہٰذا میرے لیے انھیں تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ باشعور پاکستانی تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں!

☆☆☆☆

Scanned with CamScanner

نامے میرے نام

سیّد مشکور حسین یاد

جناب محترم! عزیز محترم اور برخوردار، سعادت اطوار محترم حضرت قائم نقوی صاحب آپ نے ماہنامہ ''نمود'' نکالا اور کچھ بے وقوف اور کم عقل لوگوں کے مطابق ادبی جریدہ نکالنا ہمیشہ ایک طرح کی بے وقوفی میں شمار ہوتا ہے کیونکہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ادب کون پڑھتا ہے۔

لیکن میں سمجھتا ہوں لوگ ادب پڑھتے ہیں، پڑھنے سے شوق رکھنے والے لوگ اور آپ جانتے ہیں ایسے لوگ آج ہی نہیں ہمیشہ سے معاشرہ میں زیادہ نہیں ہوتے کم ہوتے اور بہت کم ہوتے ہیں، لیکن میرا ہی کہنا یہ بھی ہے کہ یہ کم لوگ چونکہ اپنی جگہ معمولی لوگ اور عام لوگ نہیں ہوتے اس لئے معاشرے میں ان کا بہت اثر ہوتا ہے۔

تو پیارے قائم نقوی آپ نے ادبی جریدہ نکال کر بہت عمدہ کام کیا ہے لیکن وہی بات کہ اس کے لئے ڈٹنا ہوگا، سینہ تان کے اور سر اونچا کر کے، اگر آپ کا سر جھک گیا تو سمجھنا آپ گئے..... باقی آپ کا سر کیوں جھکے گا ہم جو اسے اونچا رکھنے کے لئے حاضر ہیں یعنی آپ نے سر جھکایا اور ہمارا مکّہ آیا۔

محمود احمد قاضی

تم تو بھئی اب پگ پگ چلنے کے بعد پوری رفتار سے بھاگنے لگے ہو، لیکن یہ ادب کی میراتھن ریس ہے۔ اس لئے ٹھوکر سے ہمیشہ بچنے کی کوشش کرنا۔ ویسے اب تم ہونہار ایڈیٹروں کی طرح اداریہ باز بھی ہو گئے ہو۔ مبارکباد! تمہارے لئے اور نمود کے مواد کے لئے دعائیں۔ حسبِ حکم ایک مضمون اور افسانہ حاضر ہے۔

شاہدہ حسن

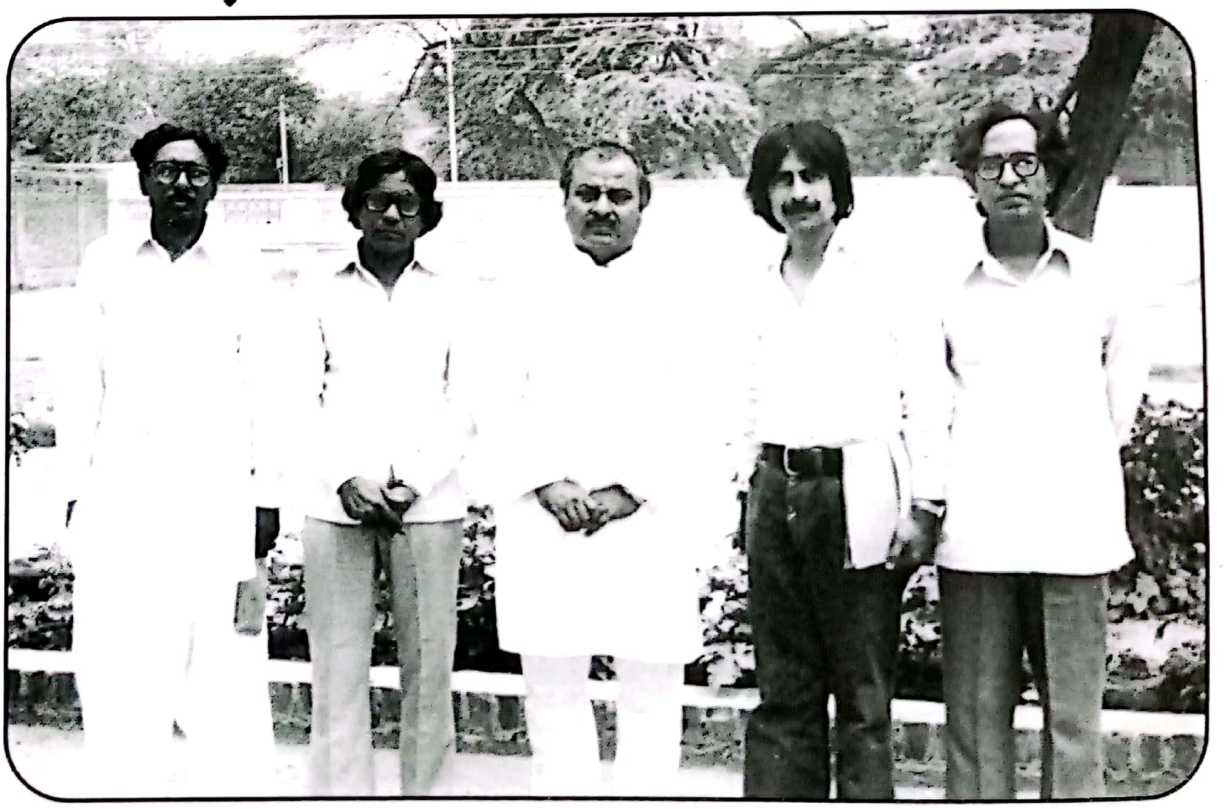
سلام و آداب! ماہنامہ ''نمود'' موصول ہوا۔ زندگی اور فن سے محبت کرنے والوں کی طرح، میری جانب سے بھی مبارکباد قبول کیجئے۔ آپ سے ٹیلی فون پر گفتگو ہوئی تھی، وعدہ کیا تھا کہ جلد آپ کو کچھ بھیجوں گی۔ میں کئی ماہ سے ملک سے باہر تھی۔ ابھی واپسی ہوئی ہے تو چیزوں کو پھر سے ترتیب دینے میں لگی ہوں۔

رسالے کے مندرجات میں خاصی اچھی چیزیں شامل ہیں۔ مگر ابھی تک پورا پرچہ نہیں پڑھ سکی۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر، قیصر نجفی اور تنویر قاضی کی تحریریں پسند آئیں۔ مضامین، غزلیں، افسانے، نظمیں..... آپ سے سبھی اصناف کی نمائندگی رکھی ہے۔ ہر پرچے کا مزاج خود بخود بنتا چلا جاتا ہے۔ تنوع اور زندگی کے جاری و ساری عمل سے تخلیقی وابستگی پیش نظر ہو تو اچھی تحریروں کے انتخاب میں آسانی رہتی ہے۔ امید ہے ''نمود'' کی ہر تازہ اشاعت کے ساتھ ہمیں ادب و شعر کی تازہ تر رُتوں کی آمد کا احساس ہوگا۔

Scanned with CamScanner



حمایت علی شاعر، اختر الایمان، محسن بھوپالی

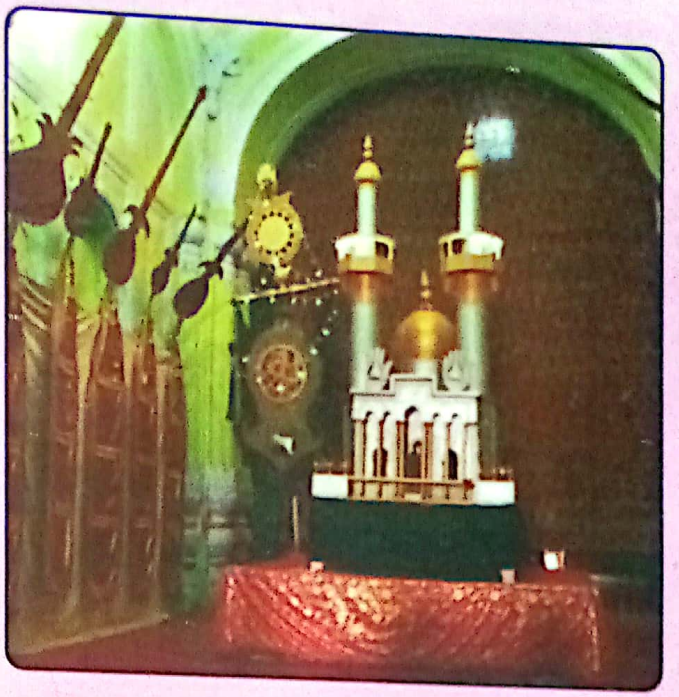


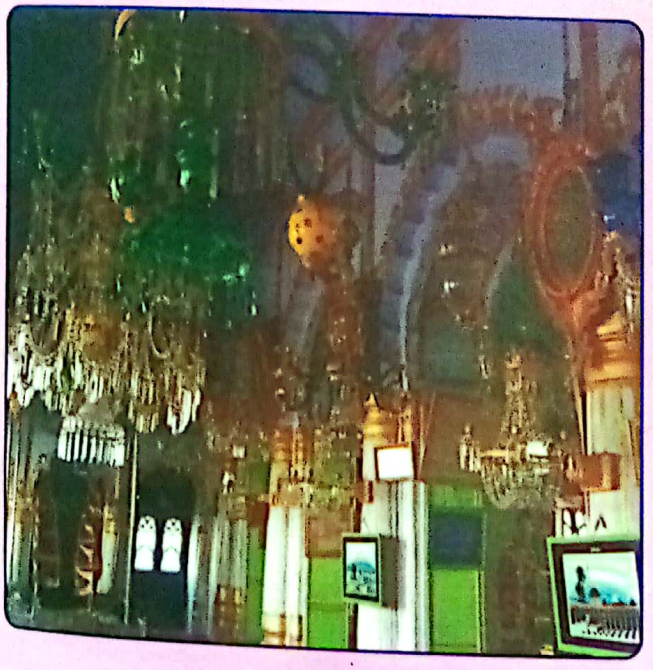
حفیظ صدیقی، عبید اللہ علیم، جمیل اختر خان، نسیم درانی، ڈاکٹر رشید انور

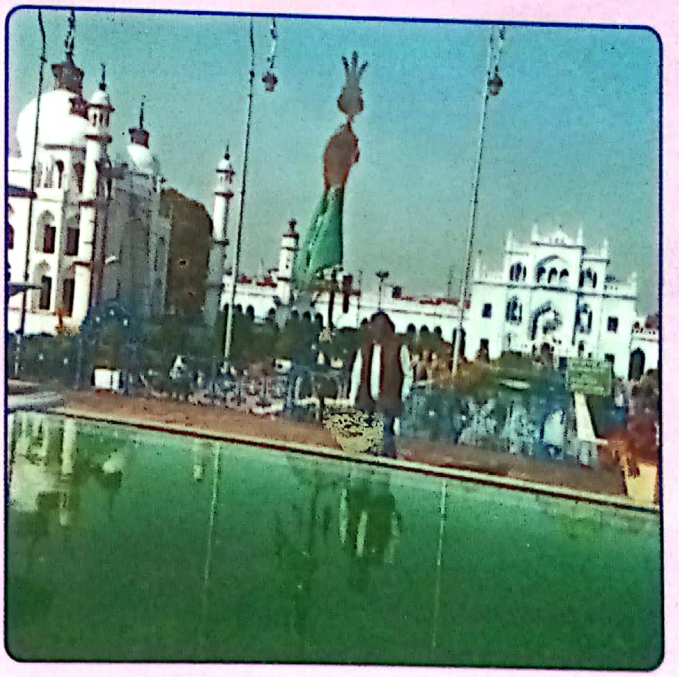
Scanned with CamScanner

Monthly NAMOOD Lahore Oct-Nov-Des 2014









لکھنوء انڈیا کے بڑے امام بارگاہ اور چھوٹے امام بارگاہ کے چند دلکش مناظر

Mr. Books
920000 607774
MAHNAMA NAMOOD
ID: 3
Rs..60

Scanned with CamScanner